16
5618

اصل واصول شیعہ

آیت اللہ الشیخ محمد الحسین کاشف الغطاء

البلاغ المبین
اسلامی تحقیقاتی واشاعتی ادارہ

81589

نام کتاب: اصل و اصول شیعہ

مؤلف: آیۃ اللہ الشیخ محمد الحسین آل کاشف الغطاءؒ

مترجم: سید ابن حسن نجفی

تاریخ: ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ۔ مئی ۲۰۰۶ء

ای میل: info@al-balagh.org

ویب: http://www.al-balagh.org

ناشر: البلاغ المبین۔ اسلامی تحقیقاتی و اشاعتی ادارہ

پوسٹ بکس نمبر ۴۶۹۔ اسلام آباد۔ پاکستان

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذخیرہ

آیۃ اللہ کاشف الغطاءؒ

از سید شمس نجفی

حلہ دریائے فرات کے کنارے عراق کا وہ شہر خوباں ہے، جس کا پرانا رشتہ تو بابل کی گلیوں سے ملتا تھا مگر طلوع اسلام کے بعد اس کی بہاروں میں کچھ ایسا نکھار آیا کہ اس بستی کی ہر راہ و منزل نے مذہب حق کے ایوان تمدن کو شمع و گل کا اتنا بڑا اور لازوال ذخیرہ پیش کیا جسے دیکھ کر دین خدا کی تاریخ جھوم اٹھی۔

حلے کے جنوب میں جناجہ نامی ایک آبادی ہے۔ قدیم زمانے سے اس میں شیخ خضر بن محمد بن یحییٰ بن مطر بن سیف الدین مالکی کا کنبہ آباد تھا، لیکن بارہویں صدی ہجری میں شیخ خضر[1] اپنے گھرانے سمیت نجف اشرف چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

مولائے متقیان امیر المؤمنین علیہ السلام کے قبہ مبارکہ کی گھنی چھاؤں اور علم و دانش سے چھلکتے ہوئے اس معمورے میں پروردگار عالم نے شیخ خضر کو شیخ جعفر کبیر جیسا فرزند ارجمند عطا فرمایا۔

یہ وہی عظیم دانشور ہیں جنہیں ان کے فقہی شاہکار کشف الغطاء کی نسبت سے کاشف الغطاء کہا گیا اور پھر یہ نام ان کے گرامی مرتبت قبیلے کی پہچان بن گیا۔

شیخ جعفر کاشف الغطاء اعلی اللہ مقامہ عرفان و آگہی کا چلتا پھرتا مجسمہ اور اخلاق الٰہی کی ایک متحرک درسگاہ تھے۔ صاحب مستدرک الوسائل میرزا حسین نوریؒ فرماتے ہیں:

> یوں تو ہمارے تمام علماء اپنے دور میں علم و تقویٰ کی علامت اور آپ اپنی نظیر تھے مگر حرف حق یہ کہ بزرگ عالی قدر شیخ جعفر بن

---

[1] اس گھرانے کا تعلق امیر المومنین (ع) کے شاگرد رشید "مالک اشترؒ بن الحارث النخعی" سے تھا۔ اس لیے پورا خاندان اپنے آپ کو مالکی کہلوانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

Marfat.com

شیخ خضر جناجی نجفی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ممدوح نے اپنی گراں بہا تصنیف کشف الغطاء کے ذریعے قوانین شریعت اور فقہی مشکلوں کو حیرت انگیز حد تک آسان بنا دیا۔ یہ کتاب پڑھیے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سبک رفتار کشتی نہایت بے تکلفی سے آب و حباب کو چیرتی ہوئی ساحل مراد سے لگ گئی ہو۔

فقہ و اصول میں مکاسب و رسائل جیسا تخلیقی کارنامہ انجام دینے والے فخر روزگار، خاتم الفقہاء والمجتہدین شیخ مرتضی انصاری[1] نے اس بیش بہا تصنیف کے بارے میں فرمایا تھا:

شیخ جعفر کبیر نے کشف الغطاء میں جن اصول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے اگر کوئی شخص واقعاً انہیں ٹھیک سے سمجھ لے تو میں اسے مجتہد مان لوں گا۔

یہ تو ہوئی کتاب کی بات۔ اب رہی خود صاحب کتاب کی شخصیت۔ تو اس بارے میں شیخ عبدالحسین تہرانی جو آیۃ اللہ نوری کے استاد تھے، ارشاد فرماتے ہیں:

شیخ جعفر کے ذوق عبادت، گریۂ شب، دعائے سحرگاہی اور شریعت کے احکام بجالانے کے شوق و انہماک کو دیکھ کر یقین آنے لگتا تھا کہ جناب امیر علیہ السلام نے اپنی دلآویز گفتگو سے احنف بن قیس کے دل و دماغ کو جس نمونے کے صحیح سلوتر آدمی کا پیکر عنایت کیا تھا اس انداز کے بس! یہی ایک مرد کامل ہیں۔

شیخ جعفر، استاد کل اور علمی دنیا کی تاریخ ساز شخصیت محمد باقر وحید بہبہانی[2] کے شاگرد رشید تھے اور سید مہدی بحرالعلوم[3] جیسے دیدہ ور حق شناس نے ان کی روحانی تربیت میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

خود ان کے تلامذہ کرام کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ بیس ہزار صفحات اور تقریباً پچاس جلدوں پر مشتمل اسلامی قوانین کے دائرۃ المعارف جواہرالکلام کے مدون شیخ محمد حسن نجفی کا اسم گرامی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نگاہ کسی جھجک کے بغیر

---

[1] متوفی ۱۲۸۱ھ [2] متوفی ۱۲۰۵ھ [3] متوفی ۱۲۱۲ھ

Marfat.com

یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ جعفر کبیر کے علمی آثار صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اصل و اصول شیعہ کے مصنف اسی دودمان لوح وقلم اور خاندان نور وحکمت کے چشم وچراغ ہیں جس کے مورث اعلیٰ شیخ جعفر کبیر صاحب کشف الغطاء تھے۔

آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۶ء مدینۃ العلم نجف اشرف میں پیدا ہوئے۔

بنیادی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کفایۃ الاصول جیسی گراں بہا کتاب لکھنے والے برجستہ عالم شیخ محمد کاظم ہروی خراسانی[1] سے اصول فقہ پر عبور حاصل کیا۔

فقہی قواعد میں بصیرت حاصل کرنے کی غرض سے پہلے تو شیخ محمد رضا ہمدانی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ بعد ازاں اس دور کے سب سے بڑے قانون داں اور عملی قوانین کے مثالی مجموعہ عروۃ الوثقی کے آفریدگار سید محمد کاظم طباطبائی یزدی[2] کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔

علم حدیث میں تبحر حاصل کرنے کے لیے آپ نے مایہ ناز تالیف مستدرك الوسائل کے جامع حاج میرزا حسین نوری[3] کی خدمت میں حاضری دی۔

نیز فلسفہ، کلام اور حکمت و ہیئت پر گرفت مضبوط کرنے کے خیال سے شیخ احمد شیرازی، شیخ محمد باقر اصطہباناتی اور شیخ محمد رضا نجف آبادی جیسے پایہ کے دانش مند اساتید سے بہرہ مند ہوئے۔

سید محمد کاظم یزدی طباطبائی اعلی اللہ مقامہ[4] کی رحلت کے بعد آیۃ اللہ کاشف الغطاء کو جو بلند مقام ملا، نیز بین الاقوامی پیمانے پر جتنی شہرت حاصل ہوئی وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

ممدوح اپنی غیر معمولی ذہانت، مسلمہ زعامت، زبان زد عام شجاعت، سیاسی بصیرت اور اجتماعی شان وشوکت کے لیے بھی ضرب المثل تھے۔ اسی طرح تحریر وتقریر میں بھی آپ اپنا جواب تھے۔ عربی زبان وادب پر کاشف الغطاء کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی اس خوبی سے متاثر ہو کر شیخ العروبہ احمد زکی پاشا اور امیر البیان شکیب

---

[1] متوفی ۱۳۲۹ھ [2] ۱۳۱۲ھ - ۱۳۳۷ھ [3] متوفی ۱۳۲۰ھ [4] ۱۳۳۷ھ

Marfat.com

ارسلان نے بھی عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں نیز آپ کے خطبات و مقالات اور پھر آپ کی لکھی ہوئی کوئی اٹھائیس بیش قیمت کتب اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں ۔

شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کے سامنے کچھ مقاصد تھے اور ان میں سب سے بڑا ہدف دنیائے اسلام کی فکری آزادی، ذہنی بیداری ،سیاسی استقلال، جغرافیائی استحکام ، ہمہ جہتی ترقی اور ملت مسلمہ کا سچا قدرتی اتحاد تھا ۔

اسی غرض کے حصول کے لیے آپ نے ہمیشہ صریر خامہ اور نوائے سروش کے ساتھ اپنے آپ کو حرکت میں رکھا۔ اصل و اصول شیعہ اسی جذبے کی عکاس ہے! نیز مغربی سامراج کے خلاف کویت اور نجف کے محاذوں پر تفنگ بردوش ہو کر گرم جنگ میں عملی شرکت اس عظیم مجاہد کے شعور حریت کی بہترین ترجمان ہے۔

جس زمانے میں استعماری کارندوں نے دینی حلقوں کو یہ باور کروا دیا تھا کہ علمائے کرام کے لیے سیاست شجرہ ممنوعہ اور سیاسی حالات کو مرکز توجہ بنانا بہت بری بات ہے ۔اس زمانے میں آیۃ اللہ کاشف الغطاء فرماتے تھے :

> میں سر سے پاؤں تک سیاست میں ڈوبا ہوا ہوں۔ سیاست میں حصہ لینا میرا فرض منصبی ہے۔، یہ میری ذمہ داری ہے اور میں اس سلسلے میں اپنے ضمیر اور اپنے خالق یکتا کے سامنے جوابدہ ہوں ۔

آپ اکثر امام معصوم علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی کو دہرایا کرتے تھے :

> خداوند عالم نے علماء سے اس بات کا وعدہ لیا ہے کہ وہ عاجز، کمزور ،بے نوا اور فاقہ کش عوام کا حال زار دیکھ کر نہ کسی سے سمجھوتہ کریں گے اور نہ ہی مصلحتوں کا سہارا لے کر خاموشی روا رکھیں گے ۔

مرحوم نے اپنے نظریات کی نشر واشاعت اور اپنے عزائم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے متعدد ملکوں کا دورہ کیا ۔

۱۳۲۸ھ میں آپ فریضہ حج بجا لانے کے لیے حجاز مقدس گئے ۔ وہاں سے شام کے لیے رخت سفر باندھا ۔ بعد ازاں لبنان کی جانب عزیمت فرمائی ۔ لبنان پہنچ کر کچھ عرصہ صیدا میں ٹھہرے اور پھر تقریباً دو مہینے تک بیروت سمیت لبنان کے صنوبر

Marfat.com

زار میں مختلف شہروں کو فیض پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے اور کوئی تین ماہ وہاں قیام فرمایا۔

قاہرہ میں جامعہ ازہر کے دانشوروں اور دوسری باسواد اور بااثر شخصیات سے آپ نے صرف تبادلہ فکر ونظر ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کی سوچ کو ایک رخ دیا اور ان کے ذہن کو ایک جہت عطا فرمائی۔

وادی نیل کے ثقافت خیز ماحول میں اس نابغہ عصر نے جو نمائندہ خطبے دیے، جو بینظیر تقریریں کیں، ارباب دانش و بینش انہیں علم و ادب کا بہت قیمتی سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

۱۳۵۰ھ میں آپ نے فلسطین میں منعقد ہونے والے مؤتمر اسلامی کے اجتماعات میں شرکت کی اور پھر القدس کے بعد حیفا، نابلس اور یافا بھی تشریف لے گئے۔

پس ازآں دو سال گزرے ہوں گے کہ آپ پہلی بار ایران کے سفر پر نکلے۔ یہاں آستان قدس رضوی کی زیارت سے مشرف ہو کر مدتوں شیراز، کازرون، بوشہر، آبادان، ہمدان اور تہران میں وہاں کے کم و کیف حیات کا جائزہ لیتے رہے۔

دوسری مرتبہ ۱۳۶۶ھ میں آپ نے ایران کا ارادہ کیا اور کچھ وقت شہر کرند میں گزارا نیز تیسری دفعہ ۱۳۶۹ھ میں پھر عازم ایران ہوئے۔ اس مرتبہ زندگی کی زیادہ سانسیں مشہد مقدس میں لیں۔ ساتھ ساتھ یہاں کے نامی گرامی علماء وفقہاء سے مذاکرات کیے اور بہت سے اہم مسائل پر بحث و گفتگو کی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔

۱۳۷۰ھ میں ایک بار پھر جناب نے شام و لبنان وغیرہ کا قصد فرمایا، مگر یہ سفر تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے کرنا پڑا۔ کیونکہ علالت جڑ پکڑ چکی تھی اور معالج چاہتے تھے کہ غیر معمولی مشاغل سے دور رہ کر آپ کسی صحت افزا مقام پر آرام فرمائیں، لیکن کاشف الغطاء جیسی ہمہ دل سوز و ہمہ جاں تپش ہستیوں کے لیے یہ کہاں ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جلد ہی وطن لوٹ آئے اور معمول کے مطابق اپنے کاموں میں لگ گئے۔

۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کی خصوصی دعوت پر آپ مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے نجف سے کراچی تشریف لائے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اپنی بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود لاہور، پشاور، راولپنڈی اور آزاد کشمیر کے

Marfat.com

مرکزی شہر مظفر آباد بھی گئے۔

ان تمام مقامات پر آپ نے جو تقاریر کیں، انہیں مسلمانوں کے سیاسی ادب میں نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔

آیۃ اللہ کاشف الغطاء کی پوری زندگی اور اس کی ہر گھڑی زبان و بیان اور کلک و قرطاس کے ذریعہ جہاد کرتے ہوئے گزری۔ اب بھلا ایسے لوگ زیادہ دن کہاں جیتے ہیں۔ چنانچہ جب طبیعت زیادہ بگڑی تو پہلے بغداد جا کر علاج کروایا۔ شروع شروع میں قدرے افاقہ ہوا اس لیے گھر آ گئے۔ مگر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ بیماری نے دوبارہ زور پکڑا اور بالآخر بغداد کے الکرخ ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ اب کے یہاں بھی مداوا نہ ہو سکا تو ایران کے شہر کرند کی درمان گاہ لے جایا گیا لیکن رہے نام اللہ کا۔

۱۸/ ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۵۴ء، دوشنبہ کا دن تھا کہ فرزندان توحید میں عقابی روح جگانے والے بیدار مغز قائد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مگر طے شدہ حقیقت یہ ہے کہ جن ہستیوں کی انگلیاں فگار اور خامہ خونچکاں رہا ہو وہ مرتے نہیں امر ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر نقش پکار پکار کر کہتا رہتا ہے۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

☆☆☆☆

مضمون کے مآخذ

۱۔ ریحانۃ الادب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حجۃ الاسلام میرزا محمد علی مدرس

۲۔ مالك الاشتر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حجۃ الاسلام شیخ عبدالواحد مظفر

۳۔ فقهای نامدار شیعه ۔۔۔۔۔۔۔۔ حجۃ الاسلام عبدالرحیم عقیقی

۴۔ ملامح من حياة كاشف الغطاء ۔۔۔ استاد محمد شریف آل کاشف الغطاء

۵۔ محاضرات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حجۃ الاسلام سید ابن حسن نجفی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب میں نوجوان تھااور میری عمر ۲۰ سال بھی نہیں تھی تو اسی وقت سے میں سیر و سیاحت کا بہت شوقین تھا۔ اسی لئے عراق کے اکثر شہروں کو میں نے دیکھ لیا اور اکثر دیہات اور قصبوں کی گردش بھی مکمل کی۔ اس سرزمین کے چھوٹے بڑے لوگوں سے ملاقات کی۔ یوں لوگوں کے بہت سے اخلاق و عادات اور آداب و رسوم سے آگاہی حاصل کر لی۔ اس حوالے سے میں نے گوناگوں مضامین بھی لکھے ان میں سے بعض تحریروں کو پڑھنے والوں نے پسند کیا۔

جب میں لواء الدیلم کی گلیوں میں پھر رہا تھا تو وہاں میں نے شیعوں کی عادات ورسوم، اخلاق وعقائد اور مرنے کے بعد ان کے انجام کے بارے میں ایسی باتیں سنیں جو الف لیلیٰ کے افسانوں اور قمر الزمان کے خوابوں سے زیادہ مشابہت رکھتی تھیں حالانکہ فرات کے کناروں پر بسنے والے شیعوں اور لواء الدیلم کے سنیوں کے درمیان صرف چند میل کا فاصلہ ہے۔ (یوں وہ اپنی آنکھوں سے شیعوں کے عقائد و اعمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔)

گزشتہ سال (۱۳۵۴ ہجری کو) میں نے مصر، فلسطین اور شام کا سفر کیا تو میری ملاقات وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے سے ہوئی۔ میں نے جو باتیں لواء الدیلم میں سنی تھیں اگر ان سے زیادہ نہ ہوتو کم از کم اس کے برابر (شیعوں کے خلاف خرافات اورتہمتوں پر مبنی) باتیں مجھے وہاں بھی سننے کو ملیں۔ جو کچھ میں نے وہاں سنا ان میں سے چند چیدہ باتیں یہ ہیں

- شیعوں کے لئے جانوروں کے دم کے مانند دم ہوتے ہیں۔
- وہ دوسرے انسانوں کی طرح کھانا پینا نہیں جانتے۔
- وہ تناسخ کے قائل ہیں جس کے مطابق مرنے کے بعد ان کی ارواح کسی

Marfat.com

دوسرے حیوان کے جسم میں حلول کرتی ہیں

اور اس طرح کی دوسری بے سروپا عجیب وغریب باتیں۔

سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ میں نے ایسی کتابیں بھی پڑھی ہیں جن کے قلمکار عالم و فاضل، ادیب اور محقق ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اس کے باوجود وہ اپنی کتابوں میں شیعوں اور ان کی تاریخ کے حوالے سے ایسی باتیں لکھتے ہیں جو تناقض گوئی، گمراہ سازی، تحریف اور بے سروپا باتوں پر مشتمل ہیں۔ ان باتوں سے بچوں کی ہنسی نکل جاتی ہے اور بڑوں کا دل خون ہوتا ہے۔ بچے اس لیے ان پر ہنستے ہیں کہ ان کی فطرت سلیم اور منطقی ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کرتے جبکہ بڑوں کا دل خون اس لئے ہوتا ہے کہ وہاں ایک ایسے اسلامی فرقے کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہوتی ہے جس نے اسلام کا دفاع کرتے ہوئے بہت سخت مشکلات و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا ہے اور اس فرقے کا دامن ان تمام تہمتوں سے بالکل اسی طرح پاک و منزہ ہے جس طرح بھیڑیا حضرت یوسفؑ کے خون سے۔ جن باتوں کو میں نے اس گروہ سے زیادہ سنی تھیں اوران کی کتابوں میں پڑھی تھیں ان کے بارے میں عظیم رہنما علامہ بزرگ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نجفی سے میں خط و کتابت کیا کرتا تھاتو آپ اس سختی کو میرے لئے آسان فرما دیتے تھے اور جو باتیں میں نے پڑھی تھیں ان سے کہیں زیادہ مجھے سناتے تھے تاکہ وہ مجھے یہ بات تاکید سے سمجھا دیں کہ ان اوہام و خرافات کو کشف کرنے والا پہلا انسان میں نہیں ہوں اور اس بات کی جانب بھی میری راہنمائی کریں کہ اہل قلم کی طرف سے گمراہ سازی کا یہ رویہ صرف آج کے معاصر لکھاریوں تک محدود نہیں بلکہ پہلے زمانے کے مؤرخین نے بھی ان پر سبقت حاصل کر لی ہے۔

جب اسی موضوع کے بارے میں میرے اور علامہ موصوف کے درمیان خط و کتابت جاری تھی تو انہی ایام میں آپ اتحاد امت کی دعوت کو عمومیت بخش رہے تھے اور مسلمانوں کو مسلکی اختلافات پر کاری ضرب لگانے کی دعوت دے رہے تھے۔ در حقیقت آپ کی ذات وہ ہستی تھی جس نے اسلام کی نجات کے لیے واضح راستہ بنایا اور اس راہ کا دروازہ کھولا۔ جس میں یہ تاثیر تھی کہ اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کو بالادستی

Marfat.com

حاصل ہو۔ پھر آپ نے محافل و مجالس سے خطاب فرمایا اور فرزندان توحید کے جم غفیر کو وحدت المسلمین کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے پر ابھارا اور انہیں بتایا کہ وہ گروہی و مسلکی نعروں، کینہ توزیوں اور مسلمان فرقوں کے حوالے سے بدگمانی کو دفن کر دیں اگرچہ مفاد پرستوں اور افتراق انگیز طاقتوں کی گمراہ کن کاوشیں بے شمار ہی کیوں نہ ہوں۔

مسلمانوں کی عزت و شہرت آپ کو بہت عزیز تھی اسی لیے آپ نے سفر کی سختیوں اور راستے کی مشکلات کو برداشت کیا تا کہ آپ ارض موعود، یعنی سرزمین مقدس پہنچ سکیں اور وہاں قدس شریف میں منعقد ہونے والے مؤتمر اسلامی کے اعلیٰ سطح کی کانفرنس میں شرکت کر سکیں اور مسلمانوں کو اختلافات چھوڑ کر متحد ہونے کی دعوت دے سکیں اور اللہ کے اعلیٰ وارفع دین کی سربلندی کے لیے کدورتوں کو دفنا کر مشترک سعی و کوشش کی جانب بلا سکیں۔

واضح ہے کہ جس اہم پیغام کو لے کر یہ عظیم رہنما اٹھا جو دین میں واضح برہان کی حیثیت رکھتا تھا اور دینی امور میں ان کی تعلیمات و فرامین پر لوگ بھروسہ کرتے تھے۔ ایسی عظیم ہستی کا یہ پیغام واقعاً ایک عظیم دعوت تھی اور بہت بڑا کام۔ یہ تحریک اور دعوت ایک ایسا سمندر تھا جس کی طوفانی موجوں سے کھیلنے والا سربلند اور خندہ پیشانی سے سلامتی و نجات کے ساحل تک نہیں پہنچ سکتا لیکن ہمارے اس عظیم رہبر و رہنما جناب کاشف الغطاء (جن کی قلبی طہارت اور خلوص نیت کی گواہی ہر انسان دیتا ہے چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، معزز ہوں یا عام لوگ) نے اپنی نیت کی پاکیزگی کی وجہ سے اس سمندر کو پار کر لیا اور اس راہ میں ہر قدم پر کامیابی نے آپ کا قدم چوما۔

آخر میں ہماری آرزو یہ ہے کہ اسلامی نہضت و تحریک کسی خاص مسلک و مذہب اور گروہ سے مختص نہ رہے کیونکہ آج امت مسلمہ کو ایسی مساعی جمیلہ کی انتہائی سخت ضرورت ہے جن میں شیعہ و سنی کی سطح سے بالاتر ہو کر تمام مسلمان مذاہب و مسالک مل کر حصہ لیں۔

ہاں! آج امت ایسی مشترکہ کوششوں کی سخت محتاج ہے جس میں تمام مسلمان شریک ہوں تا کہ آپس میں پھیلے ہوئی بدگمانی کو باہمی اعتماد کی فضا میں تبدیل کیا جا سکے۔ ایک ایسے مشترکہ جہاد کی ضرورت ہے جو مسلمان فرقوں پر حاکم ایک دوسرے سے

Marfat.com

دوری اور جھگڑا فساد کی فضا کو محبت و دوستی کے ماحول میں بدل سکے۔

یہ کتاب جو امام موصوف نے اسی مقصد کے حصول کے لیے تحریر فرمائی ہے مطلوبہ اصلاح کی کھیتی میں بوئی جانے والا شاید پہلا بیج ہو جو اللہ کی اجازت سے نشوونما پائے گا۔

عبدالرزاق حسنی
بغداد یکم ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ

☆☆☆☆☆

Marfat.com

اصل و اصول شیعہ کے بارے میں
مغربی علماء اور مستشرقین کی آراء

علامہ عصر حجۃ الاسلام الکبیر الشیخ محمد حسین کاشف الغطاء کی کتاب اصل الشیعۃ و اصولھا کی صدائے بازگشت صرف مشرقی دنیا تک نہیں تھی بلکہ جب اسے السید عبد الرزاق الحسنی نے چھاپ کر مغربی دنیا میں شائع اور تقسیم کیا تو وہاں بھی اسے عظیم شہرت حاصل ہوگئی۔ مستشرقین کی کتابوں میں بھی اس عظیم کتاب کے بارے میں تبصرے چھپ گئے اور ہم ان کتب میں سے بعض کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ "الاعتدال" نامی مجلہ میں مذکورہ کتاب سے متعلق کلمات شائع کریں تاکہ مسلمانوں کو بھی علامہ عصر کاشف الغطاء کی کتب کے بارے میں نقادوں کی آرا سے آگاہی ہو سکے۔

۱۔ اگناطیوس کراچسکوفسکی لنین گراڈ (روس) نے لکھا ہے:

بے شک یہ کتاب (اصل الشیعۃ و اصولھا) ایسی معتبر اور قیمتی کتابوں میں سے ایک ہے جس سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا۔ میں اس کا مطالعہ کتاب فجر الاسلام کے ساتھ تقابلی زاویۂ نگاہ سے کروں گا جسے میں نے گزشتہ سال حاصل کیا تھا۔

۲۔ شخت فی کونیکوموج (جرمنی) لکھتے ہیں:

جب میں اس سال کے سفر سے چند دن قبل واپس پہنچا تو میں نے کتاب اصل الشیعۃ و اصولھا پائی۔ میں آپ (کتاب کا ناشر سید حسنی) کا اور جناب شیخ

Marfat.com

علامہ محمد حسین آل کاشف الغطاء کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے بہت علمی استفادہ کیا اور میں طلباء کو بھی اس سے آگاہ کروں گا تاکہ وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ پس اس کے لیے صاحب علم سے زیادہ تعلیم کا کون حقدار ہو سکتا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر ھ۔ ریز استنبول (ترکی) لکھتے ہیں:

میں نے کتاب اصل الشیعة و اصولها کا مطالعہ کیا جسے آپ نے ہدیہ کیا تھا۔ میں نے اسے ایسا تحفہ پایا جس کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی اور جناب علامہ محترم المقام مؤلف (علامہ محمد حسین آل کاشف الغطاء) جو عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں اس پر شکر گزار ہوں اور مستشرقین حضرات کو بھی اس کتاب کی ضرورت کی طرف توجہ دلاؤں گا تاکہ وہ بھی اسے حاصل کریں۔

۴۔ سالم کرنکوی برن کالج جرمنی لکھتے ہیں:

اصل الشیعة و اصولها کے ارسال کرنے کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں نے پوری توجہ کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے، جو صحیح شیعہ اعتقادات کے بارے میں معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے، بہترین مصادر میں سے ہے۔ میں اس کی تعریف میں وہی کہوں گا جو خود علامہ مؤلف نے فرمایا ہے۔ میں نے اسے نہایت اختصار کے ساتھ ساتھ واضح بھی پایا۔ وہی سارے مطالب اس میں پائے جو ضخیم کتابوں سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے باجود کیا ممکن ہے اس زمانے میں ہر قدیمی اعتقاد کی پیروی کی جائے، جبکہ آج تہذیب و تمدن نے بڑی ترقی کی ہے؟ رسول اللہؐ اگر آج زندہ ہوتے تو یقیناً بعض ایسی چیزوں کی حلیت کا حکم دے دیتے جو گزشتہ اور قدیم زمانے میں حلال نہیں تھیں۔ مثلاً مؤلف نے اپنی تصویر اور فوٹو گرافی کی اجازت دی ہے، جبکہ یہ چیز قدما کے نزدیک اور آثار ائمہ (علیہم السلام) کی رو سے جائز نہیں۔ لیکن اس حوالے سے مجھے کوئی گفتگو نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ علامہ مؤلف نے اعتقادات اہل تشیع کو جو صدر اسلام میں تھے، بیان کرنے کا ارادہ فرمایا ہے اور واقعاً نہایت وضاحت کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھایا ہے اور میں اس مملکت کے مستشرقین کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مذکورہ کتاب خریدیں تاکہ ان کے علم میں اضافہ ہو جائے۔

Marfat.com

الاعتدال: ہم نے جناب علامہ کاشف الغطاء کو سالم کرنکوی کی گفتگو سے شریعت اسلامیہ میں تصویر کے بارے میں وہ جو کچھ کہتے تھے، آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا: شریعت میں جس تصویر کا بنانا حرام ہے وہ جاندار چیزوں کی ہاتھوں کے ذریعے مجسم تصویر (بت) بنانا ہے۔ لیکن فوٹوگرافی اور اس جیسی چیزوں کی حرمت کی شرعی دلیلیں نہ ان کو شامل ہیں اور نہ ہی مقصود ہے، بلکہ یہ اصل مباح پر باقی ہیں۔ دین اسلام کا دامن نہایت وسیع ہے۔ اس کے اندر سعۂ صدر ہے۔ اسلام کسی بھی صحیح تہذیب و تمدن خواہ وہ جدید ہو یا قدیم، کے مخالف نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہمگام ہونے کے لیے تیار ہے۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

مجلۂ الاعتدال کے سال اول کے دوسرے شمارے کے آغاز میں شیخ العروبہ جناب علامہ احمد زکی باشا نے اصل و اصول شیعہ کے ناشر جناب ادیب السید عبد الرزاق الحسنی کے نام اس کتاب کے بارے میں جو تبصرہ ارسال فرمایا تھا۔ اس کا متن درج ذیل ہے۔

از دارالعروبہ قاہرہ

مکرمی جناب عبدالرزاق صاحب!

آپ کا نہایت احسان ہے کہ آپ نے مجھے علامہ اکبر حجۃ الاسلام کاشف الغطاء کی کتاب بطور تحفہ بھیجی۔ بے شک موصوف نے اس کتاب کی بہترین تدوین اور مفید تبویب کی ہے نیز ہمارے شیعہ بھائیوں کے بارے میں ایسے نکات سے پردہ اٹھایا ہے جن کی ہمیں خبر ہی نہ تھی جبکہ ہمارے شیعہ بھائی نہ اپنے بارے میں بات کرتے ہیں اور نہ ہم سے اپنے مذہب کا تعارف کراتے ہیں۔

استاد احمد امین نے کسی قسم کی تحقیق اور مطالعے کے بغیر بے بنیاد باتوں کا جو مجموعہ تدوین کیا ہے، اس کا خوب شکریہ ادا کرنا چاہیے، کیونکہ یہی اس بات کا موجب بنا کہ ہمارے عظیم ترین دانشور (کاشف الغطاء) اپنی علمی صلاحیتوں کے حقائق سے پردہ اٹھانے کے لیے قلم اٹھائیں اور شائستہ ترین طریقے سے جذبات کو بھڑکائے بغیر اعتراضات کا جواب دیں۔ اللہ خیر دے اس عظیم ترین دانشور کو جس نے اس مشن کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ وہ مشن ہے جس کا بیڑا اٹھانا صرف اور صرف ان (کاشف الغطا) جیسے لوگوں کا کام ہے، جنہیں اللہ انحرافات کو دور کرنے اور امت مسلمہ کو ان کی کھوئی ہوئی عظمت واپس دلانے کے لیے منتخب فرماتا ہے، تاکہ امت مسلمہ دیگر زندہ اور ترقی یافتہ اقوام کا

Marfat.com

مقابلہ کر سکے۔ امید ہے کہ موصوف دوسرے ایڈیشن میں ان نکات کو حذف کریں گے جو مسلمان گروہوں کو قریب لانے اور ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں ان کی پالیسیوں کے منافی ہیں۔

بنا بر ایں انہیں صفحہ نمبرا، ۲۴ اور ۲۵ میں مذکور باتوں (کو دھرانے) کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا نہایت احسان ہے کہ انہوں نے شیعوں کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہونے کی بات کی ہے۔ انہوں نے برہان قاطع اور روشن دلیل کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ اگرچہ آپ (احمد امین) نے یہ کہکر کہ مصر، فلسطین اور شام کے بعض لوگ شیعوں کو گناہگار ٹھہراتے ہیں، شائستگی کی حد سے تجاوز کیا ہے۔ آپ کے لیے ایسا کہنا حرام ہے۔ کیونکہ شیعہ حضرات ہمارے درمیان محترم و مکرم ہیں۔ جس نے آپ (احمد امین) کو مذکورہ بات بتائی ہے، اس نے شاید مزاح، خوش طبعی، دل لگی یا دھوکہ دینے کی غرض سے ایسا کہا ہو۔ آپ نے بعض لوگوں کی کتابوں میں جو بے بنیاد، ناروا، اختلاف انگیز، متناقض اور گمراہ کن باتیں پڑھی ہیں، یقیناً ان کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ حضرات کو ان کے عقیدے سے بحث کرنے سے دور رکھا جائے۔ لہٰذا بے بنیاد پروپیگنڈے کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ عداوت نے ان باطل پروپیگنڈوں کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ یوں مصر (جوسنی علاقہ ہے) اور ایران اس عداوت کی بھینٹ چڑھ گئے لیکن عثمانیوں اور دوسرے حکمرانوں کی استعماری اور توسیع پسندانہ سیاست کو حقائق اور لوگوں کے جذبات سے کیا سروکار؟ خلاصہ یہ کہ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ یہ عرب اقوام کی وحدت اور مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا علمبردار ہے۔

رہ گیا متعہ کا مسئلہ تو اس کے بارے میں اگرچہ موصوف نے مضبوط اور کافی و وافی دلائل کے ساتھ استدلال کیا ہے لیکن شرعی اوز اجتماعی نظام کے حوالے سے متعہ کے بارے میں میرے دل میں موجود خلش باقی رہ گئی۔ کیونکہ اگر متعہ کرنے والا آدمی متعہ کی مدت ختم ہونے پر سفر پر چلا جائے اور متعہ کے نتیجے میں بچہ پیدا ہو اور اب واپس آ جائے تو اس بچے کا کیا بنے گا؟ دانشمند محترم نے اس نکتے کی وضاحت نہیں کی ہے۔ پھر مجھے اس بات پر بھی تعجب ہوا ہے کہ موصوف نے ارکان اسلام کا ذکر کرتے

Marfat.com

وقت توحید اور نبوت کی شہادت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ کیا اس کی وضاحت ہو سکتی ہے۔

موصوف نے متعہ کے بارے میں ایک اور فرقے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور کہا ہے کہ ان کا نظریہ نص قرآن کے برخلاف ہے۔ بنابریں بعض حالتوں میں میراث سے عورتوں کی محرومی کے بارے میں (امام) رضی اللہ عنہ کے قول کا کیا بنے گا جو نص قرآن کے برخلاف ہے؟ پس حضرت عمرؓ نے جو کچھ کہا ہے وہی کچھ اس امام (علیہ السلام) کی روایت کے بارے میں بھی کہا جائے گا۔ (* ص ۱۱۸)

موصوف نے صفحہ نمبر * ۴۴ اور ۶۲ میں شیعہ امامیہ اور دوسرے شیعوں کا فرق بیان کر کے نہایت احسان کیا ہے۔

موصوف نے اس طرح بھی ہمارے اوپر لطف و احسان کرتے ہوئے ہمارے دلوں کی ٹھنڈک کا سامان کیا ہے کہ انہوں نے ان فرومایہ لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو مستشرقین کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اصلی مأخذ میں غور و فکر کیے بغیر مستشرقین کے اقوال کو تسلیم کرتے ہیں، دیکھیے * ص ۳۲، ۳۵، ۳۶، ۳۷ نیز موصوف کا یہ بھی احسان ہے کہ انہوں نے صرف اپنے ہم مذہب کے لوگوں کی بلکہ اہل سنت و الجماعت کی بھی قولی اور فکری حمایت کی ہے (دیکھیے * ص ۴۱) موصوف نے * ص ۸۴ وغیرہ میں امام (زمانہ علیہ السلام) غیبت کے مسئلے پر بھی خوب استدلال کیا ہے۔

علاوہ ازیں انہوں نے * ص ۲۴ میں علم اور احقاق حق کے سلسلے میں اپنے پرخلوص جذبات اور روشن فکری کا جو عمدہ نمونہ پیش کیا ہے اس پر اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ * ص ۴۴ میں صحابہ کا احترام ملحوظ رکھنے کی بات کی ہے۔ یہ ان کی لیاقت و صلاحیت کے علاوہ ان کی ذہانت و فطانت اور عقل و تدبیر کی علامت ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کے لیے یہ بات ممکن نہیں۔ میرے ناچیز ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ اسلام ایمان کو بھی شامل ہے، لیکن ایمان اسلام کو شامل نہیں۔ یہ دونوں مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہمارے عظیم دانشور نے ص ۸۵ میں لکھا ہے۔ اگر وہ ان باتوں کی گرہ کشائی کریں جنہیں میری ناقص عقل سمجھ نہیں سکی ہے تو یہ ان کا لطف ہوتا۔

موصوف نے کس قدر محتاط اور لطیف پیرائے میں اپنی قوم اور اہل سنت کے

---

* یہ صفحات پہلے ایڈیشن کے ہیں۔

Marfat.com

بارے میں ص ۹۵ میں گفتگو فرمائی ہے نیز ص ۷۰ میں امام (زمانہ) کی غیبت کا ذکر کیا ہے۔

امید ہے کہ انشااللہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن کتابت کی بعض اغلاط سے پاک ہوگا۔ مثال کے طور پر ص ۴۷ میں کلما آیا ہے جبکہ صحیح کل ما ہے۔ ص ۱۶ میں اعتاب آیا ہے جبکہ صحیح عتبات ہے۔ ص ۴۷ میں مما آیا ہے جبکہ درست ما ہے۔ ص ۴۹ میں کانت مجتمعةً ... علی احدهما آیا ہے جبکہ درست کانتا مجتمعتین علی احدهما ہے۔ ص ۵۶ میں شرع آیا ہے جبکہ صحیح شرح ہے۔ ص ۷۹ میں مفتی آیا ہے جبکہ صحیح مفتٍ ہے۔ ص ۸۷ میں مذکور لفظ سرادق میری معلومات کے مطابق مذکر ہے۔ شاید ہمارے سرکار اور عظیم دانشمند (کاشف الغطاء) کے پاس اس کے مؤنث ہونے پر کوئی دلیل ہو۔ اسی طرح ص ۹۰ میں ھبة الغیر آیا ہے جبکہ درست لغیر ہے۔ ص ۱۰۲ میں شیخنا آیا ہے جبکہ صحیح شیخاً ہے۔ ص ۱۱۸ میں المعول ہے جبکہ العول درست ہے۔

یہ سب کتابت کی غلطیاں ہیں، وگرنہ مؤلف اپنی جگہ پر خود سند ہیں۔ انہوں نے اپنے دلائل نہایت بہترین انداز میں پیش کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو، آپ کو اور آپ دونوں کے مخلص راقم کو کامیاب فرمائے۔

احمد ذکی

Marfat.com

حجۃ الاسلام علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاءؒ کا جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وله الحمد والمجد

سید حسنی کے نام۔ ان پر اللہ کا لطف و احسان ہو۔

مجھے وہ گرامی نامہ موصول ہوا جو عالم عرب کے بطل جلیل جناب علامہ احمد ذکی پاشا (اللہ ان کے مرتبے کو باقی رکھے اور ان جیسے علماء میں اضافہ فرمائے) نے آپ کے نام ارسال کیا ہے۔ اس مکتوب کا پوری طرح سے مطالعہ کرنے کے بعد میرا پورا وجود مسرت و سرور کی مستی سے لبریز ہوگیا۔ میں ان کی تعریف و تمجید سے زیادہ ان کی نقادی اور بھرپور تبصرے کی قدردانی کرتا ہوں اور اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کی خاطر اس جیسے مایۂ ناز اور باانصاف علماء کی حفاظت فرمائے، جنہیں سب سے پہلے مسلمانوں کے اتحاد اور تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کی فکر ہے۔

ہم مسلمان، دشمنوں سے زیادہ اس امت کو تباہی وہلاکت سے دوچار کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ جل شانہ زکی جیسے غیرتمند مصلحین کی حفاظت کر کے (ہم پر) لطف و کرم فرمائے گا اور ان شخصیات کی مساعی جمیلہ کو برکت عطا فرمائے گا تاکہ یہ لوگ امت مسلمہ کو ذلت و پستی کے ان گڑھوں سے نکال لیں جن میں وہ گرے ہوئے ہیں۔

چونکہ موصوف (اللہ ان کی عمر کو طولانی فرمائے) نے اپنے مکتوب میں بعض مسائل کے بارے میں استفسار فرمایا ہے اور ان پر روشنی ڈالنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، لہٰذا ہم ان کی خواہش کا احترام کرتے ہیں اور ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے یہاں، اپنی معلومات کے مطابق مختصر سا جواب عرض کریں گے۔ امید ہے کہ یہ قرین صواب ہوگا۔ موصوف (حفظہ اللہ) نے فرمایا ہے:

Marfat.com

شاید وہ دوسری طباعت میں ان نکات کو حذف کریں گے جو ان کی ان روش سے میل نہیں کھاتے جو مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ قریب لانے اور اسلامی مذاہب کو متحد کرنے کے لیے انہوں نے اپنائی ہے۔ چنانچہ انہیں صفحہ ۲۱، ۲۴ اور ۲۵ میں مذکور نکات کو بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

صفحہ نمبر ۲۱ میں ابوسفیان پر تنقید کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی ان سے وابستگی کے پیش نظر ان کے اسلام اور ان کے ایمان کی حقیقت سے پردہ اٹھانا مسلمانوں کو ناگوار ہوگا۔

صفحہ نمبر ۲۴ میں بعض صوفیاء و مشائخ پر تنقید کی گئی ہے۔ ان کی طرف (نعوذ باللہ) کفر و الحاد کی نسبت کیسے دے سکتے ہیں؟ ہم نے تو یہ عرض کیا ہے کہ ان کے ظاہری کلمات و بیانات سے دعوائے ربوبیت کی بو آتی ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ یہ ظاہری معانی ان کا مقصود ہرگز نہیں، مگر فنا فی اللہ اور محو کی حالت میں، وہ بیداری اور ہوش کی حالت میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بیشک محو اور فنا کی حالت میں لیس فی الدار غیر دیار (گھر میں سوائے گھر والے کے کوئی نہیں) تو یہ درست ہے اور اس حالت میں حلاج کا انا الحق (میں حق ہوں) کہنا یا ما فی جیبی الا الحق (میرے گریبان میں حق کے سوا کچھ نہیں) کہنا درست ہے۔

اس کے بعد موصوف (اللہ ان کو اپنی تائید سے نوازے) فرماتے ہیں:

رہا متعہ کا مسئلہ۔ تو اس کے بارے میں صحیح شرعی اور معاشرتی حوالے سے میرے دل میں کھٹکنے والی بات باقی رہی۔ کیونکہ اگر متعہ سے کوئی بچہ پیدا ہو اور اس کا باپ سفر میں ہو تو ہم اس بچے کا کیا کریں گے؟ علامہ صاحب نے اس نکتے پر روشنی نہیں ڈالی۔

میری عرض ہے کہ یہ نکتہ اس قدر واضح ہے کہ اس کی مزید وضاحت کے لیے نقضی اور حلی دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

Marfat.com

اس سوال کا نقضی جواب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی دائمی نکاح کے ذریعے شادی کرے، پھر بیوی کی طلاق دے کر سفر پہ چلا جائے، جبکہ بیوی حاملہ ہو تو ہم اس بچے کا کیا کریں گے؟

حلی جواب یہ ہے کہ یہ بیٹا اسی باپ کا بیٹا ہے اور اس (باپ) پر اس بچے کا نفقہ دینا واجب ہے۔ یہاں تک کہ دودھ پلانے کی مدت پوری ہو جائے اور ماں کے لیے بچے کو اپنے پاس رکھنے کا حق ختم ہو جائے تو باپ اسے خود سنبھالے گا، خواہ اس کا نکاح دائمی ہو یا انقطاعی (متعہ)۔ یہ ایک بہت واضح سی بات ہے۔ یہ مسئلہ شرعی اور معاشرتی نظام سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔

اس کے بعد موصوف (خدا ان کو حق گو بنائے) فرماتے ہیں:

(ان کی کتاب میں) ارکان (دین) کا ذکر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ انہوں نے توحید اور نبوت کی گواہی (شہادتین) کا ذکر ہی نہیں کیا۔ دیکھیے ص: ۵۸

جواباً میری عرض ہے کہ، یہ تو سچ مچ عجیب بلکہ عجیب سے بھی آگے کی بات ہوگی کہ ہم اسلام کی تعریف میں شہادتین کا ذکر نہ کریں۔ کیا شہادتین کے بغیر اسلام ممکن ہے؟

ہم یہاں اسی صفحے کی متعلقہ عبارت ہو بہو نقل کرتے ہیں تاکہ موصوف (اللہ انہیں عزت دے) خود فیصلہ کریں۔ ہم ان کا فیصلہ قبول کریں گے۔ اس صفحے میں ہم نے یوں کہا ہے:

> اسلام اور ایمان مترادف الفاظ ہیں۔ یعنی دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ یہ دونوں ایک وسیع معنی پر دلالت کرتے ہیں جو تین ارکان یعنی توحید، نبوت اور معاد پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی شخص ان تین میں سے ایک کا انکار کرے تو وہ نہ مسلمان ہے نہ مومن، لیکن اگر وہ اللہ کی وحدانیت، سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ سچ مچ مسلمان ہے۔ جو اللہ رسولؐ اور آخرت کو مانتا ہے... انتہی قولہ۔

8/589

Marfat.com

کیا شہادتین کا مقصد توحید اور سید الانبیاء کی نبوت پر ایمان کے علاوہ کچھ اور ہے؟

اس کے بعد فرماتے ہیں:

> انہوں نے متعہ کے معاملے میں ایک اور فرقے پر سخت تنقید کی ہے کہ انہوں نے نص قرآن کی مخالفت کی ہے۔ پس اس (امام) رضی اللہ عنہ کے قول کا کیا بنے گا جو (بعض مخصوص صورتوں میں) وراثت سے عورتوں کی محرومی کا حکم دیتا ہے، جبکہ یہ قول بھی نص قرآن کے برخلاف ہے۔
>
> پس جو کام حضرت عمر نے کیا وہی بات اس امام کی روایت پر بھی صادق آتی ہے... انتہی قولہ۔

جواباً عرض کرتا ہوں کہ ان دو باتوں میں واضح فرق موجود ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جب سنت (حدیث) قرآن کی مخالف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں بلکہ وہ حدیث دور پھینک دی جائے گی۔ قرآن و حدیث کے مابین مخالفت و معارضت سے یہ مراد ہے کہ حدیث قرآن کے ساتھ مکمل متعارض ہو۔ البتہ وہ مخالفت جو عام و خاص اور مطلق و مقید میں ہوتی ہے جائز ہے۔ اسی لیے اکثر بلکہ ظاہراً سارے (فقہاء) اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث کے ذریعے قرآن کی تخصیص جائز ہے۔ یعنی ایک عادل راوی کی روایت کے ذریعے تخصیص ہوسکتی ہے۔ حدیث متواتر کی بات ہی اور ہے۔ مثال کے طور پر اللہ جل شانہ قرآن میں فرماتا ہے: اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا...[1] اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ پس اگر کوئی حدیث کہے: سود حلال ہے اور تجارت حرام، تو یہ حدیث باطل ہے اور اس پر عمل جائز نہیں۔ اس قسم کی حدیث دور پھینک دی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی حدیث یہ کہے کہ بیٹے اور باپ کے درمیان سود حلال ہے یا کوئی حدیث بیوی اور شوہر کے درمیان سود کو حلال قرار دے یا کوئی روایت مالک اور غلام کے درمیان سود کو جائز بنائے تو ان احادیث پر عمل واجب ہے، بشرطیکہ ان احادیث میں صحت کی تمام شرائط موجود ہوں۔ کیونکہ اس قسم کی مخالفت کو قرآن کے ساتھ

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۷۵

Marfat.com

معارضت نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ قرآن کے عموم کی تخصیص ہے۔ پس یہاں قرآن و سنت دونوں کو باہم جمع کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ سود حرام ہے، لیکن باپ اور بیٹے، مالک اور غلام نیز بیوی اور شوہر کے درمیان سود جائز ہے۔

قرآنی عمومات کے بارے میں اس قسم کا استدلال ایک عام اور رائج مسئلہ ہے، بلکہ قرآن کے اندر کوئی عام ایسا نہیں جس کی تخصیص سنت کے ذریعے نہ ہوئی ہو۔ اگر تخصیص کا دروازہ بند کر لیا جائے تو سنت باطل ہو جائے گی اور اس کا فائدہ تقریباً ختم ہو جائے گا۔ رہا ائمہ اہل بیتؑ سے مروی حکم کہ عورتیں بعض صورتوں میں وراثت نہیں پا سکتیں یعنی غیر منقولہ جائیداد میں حصہ نہیں پا سکتیں تو یہ قرآن کے عمومی حکم: وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ... [1] ''اگر تمہارا کوئی بیٹا نہ ہو تو انہیں تمہارے ترکے کا چوتھا حصہ ملے گا۔'' کی تخصیص ہے۔ حدیث کے ذریعے آیت کی تخصیص کے بعد نتیجہ کچھ یوں ہو گا: عورتوں کو چوتھائی یا آٹھواں حصہ ملے گا، لیکن غیر منقولہ جائیداد سے نہیں۔ پس انہیں غیر منقولہ جائیداد سے کچھ نہ ملے گا۔

یہ مسئلہ متعہ کی تحریم سے مختلف ہے۔ کیونکہ متعہ کی تحریم اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مکمل برخلاف ہے، جو کہتی ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ... [2] ''پس جب تم ان سے متعہ کرو تو انہیں ان کی اجرت دے دو'' بنابرایں تحریم متعہ پر اعتراض وارد ہوتا ہے، جبکہ وراثت کے مسئلے پر نہیں ہوتا۔ یہ سب فن (استنباط) کے قواعد اور اصول الفقۃ کے ضوابط کے مطابق ہیں اور حقیقت کا علم اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

رہا موصوف (اللہ ان کا مرتبہ بلند کرے) کا یہ کہنا:

> میرے ناقص فہم کے مطابق اسلام ایمان کو شامل ہے جبکہ ایمان اسلام کو شامل نہیں نیز یہ دونوں مترادف الفاظ نہیں، جیسا کہ ہمارے ہمارے سرکار مولانا ...ص ۵۸ میں فرماتے ہیں۔ پس ہم انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اگر وہ اس مسئلے سے پردہ اٹھائیں تو ان کا کرم ہوگا... انتہی قولہ۔

ہم نے (اسلام و ایمان کے) ترادف کا جو دعویٰ کیا ہے، اس سے استدلال

---

[1] ۴ نساء: ۱۲ [2] ۴ نساء: ۲۴

Marfat.com

لفظ ایمان کے موارد استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ تحقیقی مطالعہ کرنے والے کو یقین حاصل ہوگا کہ لفظ ایمان کا غالب استعمال اس کے وسیع تر مفہوم یعنی اسلام میں ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالصّٰبِئِیۡنَ وَ النَّصٰرٰی
وَالۡمَجُوۡسَ وَالَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا[1]

اس آیت میں ایمان سے مراد اسلام کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی مسلمان، یہود اور نصاریٰ...
اس سے زیادہ واضح آیات میں سے ایک یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ...[2]

اے ایمان والو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو...

کیونکہ ایمان کے محدود تر معنی میں اطاعت شرط ہے، جبکہ یہاں ایمان کا معنی اطاعت کے بغیر بھی درست ہے۔

اگر یہاں ایمان کا محدود مفہوم مراد ہوتا تو اس کے معنی یہ ہوتے: یا ایها الذین أطیعوا اللّٰه۔ یعنی اے اللہ کی اطاعت کرنے والو (اللہ کی اطاعت کرو)، جبکہ اس کا خلل واضح ہے۔ پس یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں مراد کچھ یوں ہو: یا ایها الذین تدینوا بدین الاسلام و اطیعو اللّٰه بالعمل بشرایع الاسلام و امتثال أوامره و نواهیه ۔ یعنی اے دین اسلام پر ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو، شریعت اسلامیہ اور احکام الٰہی پر عمل کے ذریعے۔ اس طرح کی آیات زیادہ ہیں ہمارے مدعا کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی قرآن، ایمان کہکر ایمان کو مراد لیتا ہے جو وسیع تر مفہوم کا حامل ہے، جس طرح مذکورہ آیات اور اس طرح کی دیگر آیات میں استعمال ہوا ہے، جبکہ کبھی لفظ ایمان سے اس کا محدود تر معنی مراد لیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس آیت میں:

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا
اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ[1]

اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، کہدو تم ایمان نہیں لائے

---

[1] ۲۲ حج: ۱۷ [2] ۴۹ حجرات: ۱۴

Marfat.com

بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں کیونکہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝[1]

مومن تو وہ لوگ ہیں جن کے دل ذکر خدا سن کر کانپ جاتے ہیں اور آیات قرآنی کی تلاوت سن کر ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اللہ پر توکل کرتے ہیں۔

یہ وہ نکات ہیں جن کی طرف اس عظیم نقاد زکی نے تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد ہم اتحاد بین المسلمین کی خاطر "مسلمان کیسے متحد ہوں" کے عنوان سے ایک مضمون پیش کریں گے۔ ان سب امور میں ہم اللہ جل شانہ پر بھروسہ کریں گے اور دنیا بھر کے عظیم القدر علماء (جن میں سرفہرست علامہ زکی ہیں) کی حوصلہ افزائی سے مدد حاصل کریں گے۔ اس پر اور ان سب پر اللہ کی سلامتی رحمت اور برکات نازل ہوں۔

محمد الحسین آل کاشف الغطاء

یاد رہے کہ بطل عرب علامہ زکی (اللہ انہیں اپنی مغفرت اور خوشنودی سے نوازے) نے مذکورہ بالا ملاحظات سے آگاہی کے بعد ان کے جوابات نہیں دیئے۔ شاید انہوں نے ان ملاحظات کو درست اور برحق سمجھا ہو اور انہیں قبول کر لیا ہو۔ حق اس بات کا زیادہ سزا وار ہے کہ اس کو قبول کیا جائے۔ کیونکہ موصوف (اللہ ان کے مرقد کو معطر کرے) ایک باانصاف اور تعصب سے بالاتر شخصیت تھے اور صرف حق بات پر ڈٹ جاتے تھے۔ البتہ بغداد کے ایک دانشور نے اپنے مکتوب میں مذکورہ جوابات میں سے بعض پر تبصرہ کیا ہے جسے رسالہ الاعتدال نے اپنی جلد اول کے ص ۱۱۰ میں چھاپا ہے جس کا تذکرہ ذیل میں نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

---

[1] ۸ انفال: ۲

Marfat.com

علامہ الراوی کے اعتراضات اور ان کے جوابات

بغداد کے عالم جلیل سید ابراہیم الراوی نے علامہ کبیر حجۃ الاسلام کاشف الغطاء کے نام ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط ان جوابات کے بارے میں ہے جو علامہ کاشف الغطاء نے علامہ احمد زکی پاشا کے ملاحظات کے جواب میں لکھے تھے۔ یہ خط الاعتــــدال کے مذکورہ شمارے میں چھپ گیا تھا۔ خط کا مضمون درج ذیل ہے۔

مجتہد کبیر محترمی حضرت علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاء کے نام
آداب وسلام قبول ہو۔

میں نے علامہ احمد زکی پاشا کے تحفظات کے بارے میں آپ کے جواب کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے لکھا تھا: شرعی اور اجتماعی نظام کے زاویئے سے متعہ کے بارے میں میرے دل کی خلش دور نہیں ہوئی۔...جبکہ آپ نے کہا ہے کہ اس کا نقضی جواب اور حلی جواب دونوں واضح ہیں۔

اس کے بعد وہ مذکورہ نقضی اور حلی جواب نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

پس اے علامہ جلیل! آپ کے اس جواب پر ہمیں بعض اعتراضات ہیں۔

پہلا اعتراض یہ کہ شادی دو جانے پہچانے انسانوں کے درمیان ہوتی ہے۔

دوسرا اعتراض: شادی متعہ کی طرح خواہشات کی تسکین کے لیے نہیں ہوتی۔

تیسرا اعتراض: متعہ والی عورت سے شناسا، غیر شناسا مسافر اور مقیم سب جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ پس اگر وہ شخص غائب ہو جائے تو بچے کے باپ، اس کی جگہ اور جائے سکونت کا پتہ کیسے چلے گا؟ نتیجتاً وہ بچہ مجہول النسب ہوگا۔

چوتھا اعتراض: شادی بقائے نسل اور حسب نسب کی حفاظت کے لیے ہوتی

Marfat.com

ہے جسے عرب خاص اہمیت دیتے تھے۔ وہ اسے عزت و شرف کا باعث سمجھتے تھے۔ پس اگر متعہ کا سلسلہ چل نکلے تو نسلیں غیر محفوظ ہو جائیں گی اور رشتے ختم ہو جائیں گے۔

اس بارے میں آنجناب (خدا آپ کی عزت کو باقی رکھے) کیا فرماتے ہیں؟

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

☆☆☆☆☆

چونکہ ان اعتراضات کے جوابات واضح ہیں اس لیے حضرت استاد نے مجھے (جو ان کے حلقہ درس کا ایک شاگرد ہوں) حکم دیا کہ میں رسالہ الاعتدال کے زرین صفحات پر ان اعتراضات کے جوابات کو منظر عام پر لاؤں۔

اولاً: موصوف نے کہا ہے کہ شادی دو جانے پہچانے افراد کے درمیان ہوتی ہے۔

ہم یہ نہ جان سکے کہ اس بات کا اصل موضوع سے حلاً یا نقضاً کیا تعلق ہے؟ اگر موصوف کی مراد یہ ہے کہ طرفین کو تمام لوگوں کے ہاں اس علاقے کے تمام باسیوں کے درمیان معروف ہونا چاہیے جہاں شادی ہو رہی ہو تو یہ غیر ضروری ہونے کے علاوہ مشکل بلکہ ناممکن ہے، خواہ شادی دائمی ہو یا موقت (متعہ)۔ لیکن اگر اس سے مراد میاں بیوی کی ایک دوسرے سے آشنائی ہو تو اس کا لازم ہونا (جیسا کہ ایک حد تک مسلمہ ہے) دائمی اور انقطاعی دونوں میں ہے۔

اسی طرح اگر اس سے مراد نکاح کے گواہوں کی آشنائی ہو تو یہ بھی دونوں قسم کی شادیوں میں مشروط ہے، بشرطیکہ ہم ہر قسم کی شادی میں دو گواہوں کو شرط قرار دیں۔

ثانیاً: رہا ان کا یہ کہنا کہ شادی متعہ کی طرح جنسی تسکین کے لیے نہیں، تو یہ باعث تعجب ہے۔ کیونکہ جنسی تسکین جس طرح متعہ سے ہوتی ہے، اسی طرح دائمی نکاح میں بھی ہوتی ہے۔ پھر دائمی نکاح کی طرح متعہ بھی طلب نسل کا ذریعہ ہے۔ دائمی شادی کرنے والے زیادہ تر جوان ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد حلال طریقے سے جنسی خواہشات کی تسکین ہی ہوتی ہے۔ ان کے ذہن میں نسل پھیلانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔

Marfat.com

اگرچہ شادی کے بعد بھی بادل ناخواستہ بچے بھی ہو جاتے ہیں۔ نسل بڑھانے کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود ان کی شادی درست ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ موصوف نے صرف جنسی تسکین کو شادی کا مقصد قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی دائمی شادی کی طرح ہے۔ دائمی کی طرح متعہ کا مقصد بھی گاہے تولید نسل، گاہے خدمت، گاہے گھر کا انتظام و انصرام اور گاہے اولاد کی تربیت، رضاعت اور نگرانی وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یہی امور وہ عورتیں بھی انجام نہیں دیتیں جن سے غیر معینہ مدت کے لیے نکاح کیا جائے؟ پھر یہ کہنے کی کیا وجہ ہے کہ متعہ والی عورتیں صرف جنسی تسکین کے لیے ہیں؟

ثالثاً: موصوف نے اعتراض کیا ہے کہ متعہ والی عورت سے شناسا غیر شناسا سب جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں ....الخ ۔(جواباً عرض ہے کہ) میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ یہ اعتراض صرف متعہ پر کیوں ہوا، دائمی نکاح پر کیوں نہیں ہوا؟ شاید اس اعتراض کی برگشت پہلے اعتراض کی طرف ہوتی ہو۔ جبکہ دونوں میں کوئی جان نہیں ہے اور اس کا بھی وہی جواب ہے۔

یہی حال چوتھے اعتراض کا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ شادی کو جائز قرار دینے کا مقصد نسل انسانی کی بقا اور نسب کی حفاظت ہے۔ فاضل محترم کی خدمت میں عرض ہے کہ نسب کی حفاظت کو دائمی نکاح کے ساتھ کس نے مختص کیا ہے؟ کیا نسب کی حفاظت عقد منقطع (متعہ) کے ذریعے نہیں کی جا سکتی؟

ان تمام اعتراض کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ متعہ اور دائمی عقد دونوں نکاح کے آداب و شرائط اور شادی کی حقیقت کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ جس طرح دائمی نکاح شناسا و غیر شناسا، مسافر اور مقیم نیز چھوٹے اور بڑے سب کے ساتھ ہو سکتا ہے نیز جس طرح دائمی نکاح میں طلاق کی صورت میں بیوی پر عدت گزارنا واجب ہے تاکہ اختلاط نسل نہ ہو نیز شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے احوال سے آگاہ رہے اور بیوی کو اپنی پہچان کرائے تاکہ پیدا ہونے والا بچہ اسی سے ملحق ہو اور نسب ضائع نہ ہو، اسی طرح متعہ والی عورت پر بھی واجب ہے کہ جب متعہ کی مدت ختم ہو جائے تو عدت کی مدت پوری کرے نیز شوہر بیوی اور بیوی شوہر کے حال و نسب کو پہچانے تاکہ بعد میں بچہ اس

Marfat.com

سے ملحق ہو۔

اگر متعہ والی عورت مدت کے دوران کسی اور سے شادی کرے تو ہمیشہ کے لیے اس مرد پر حرام ہو جائے گی، جس طرح دائمی نکاح میں ہوتا ہے اور وہ بچہ ناجائز بچہ شمار ہو گا۔ ان سب کے باجود محترم دانشور جناب الـراوی کا قول ہے: اگر متعہ رائج ہو جائے تو نسلیں غیر محفوظ ہو جائیں گی اور رشتے ختم ہو جائیں گے۔ پس اے بزرگو! اس قول میں غور وفکر کریں اور ایسی باتیں نہ کریں جو حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہوں۔

چونکہ متعہ بھی اہم احکام میں دائمی نکاح کی طرح ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ دائمی نکاح کا خاتمہ طلاق کے ذریعے ہوتا ہے، جبکہ متعہ اپنی مدت کے ختم ہونے پر ختم ہوتا ہے، ان دونوں کی بنیادی ماہیت یکساں اور قابل غور ہے۔

ابن ماء السماء۔ نزیل نجف

علاوہ ازیں ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ اصل مصیبت اور مشکل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے غیر شیعہ مسلمان بھائیوں کا غلط فہمی کی بنا پر یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ جو متعہ شیعوں کے ہاں جائز ہے وہ ان عصمت فروشوں والا عمل ہے جو مخصوص جگہوں کوٹھوں پر رہتی ہیں۔ وہاں ہر قسم کے راہگیر اور اجنبی آتے ہیں، کچھ پیسے ان عصمت فروشوں کو دیتے ہیں اور ان سے شہوت کی آگ بجھا کر چلے جاتے ہیں، پھر زندگی بھر ان کی طرف رخ نہیں کرتے۔ اگر انہیں علم ہو کہ متعہ میں بھی عقد نکاح کی ضرورت ہوتی ہے، عدت ہوتی ہے یا بری الذمہ ہونا پڑتا ہے، پہچان ضروری ہوتی ہے، متعہ سے پیدا ہونے والا بچہ اپنے باپ کا بیٹا ہوتا ہے، بچے کا نفقہ باپ پر واجب ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، اگر انہیں ان باتوں کا علم ہو اور وہ انصاف سے کام لیں تو ان کا رویہ نرم ہو گا، اعتراضات زائل ہو جائیں گے اور (بے جا اعتراضات کا) شور وغل بیٹھ جائے گا۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

امیر البیان شکیب ارسلان کا خط

اس کتاب کے مؤلف نے اپنی بعض تالیفات کے ہمراہ امیر البیان علامہ شکیب ارسلان کو ایک خط ان کے بھائی امیر عادل کے کہنے پر ارسال کیا۔ وہ اس وقت بغداد میں تھے۔ جب یہ خط امیر شکیب ارسلان کو ملا تو انہوں نے مؤلف (کاشف الغطاء) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کے بعض مندرجات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

جنیوا ۵ محرم الحرام ۱۳۵۲ھ

مخدومی و معظمی مجتہد کبیر، سید السند، والا مقام جناب استاد علامہ سید محمد حسین آل کاشف الغطاء اطال اللّٰہ بقاء!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ میں نے آنجناب کی صحت و سلامتی پر اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرما کر اسلام کو فائدہ پہنچائے۔ کتابیں بھی موصول ہوئیں۔ میں نے پہلی فرصت میں آپ کی تحریر (اصل الشیعة و اصولها) کا مطالعہ کیا اور اس سے خوب استفادہ کیا۔ آپ کی تمام تالیفات سچ مچ مفید ہیں، بلکہ یہ اس دور میں امت مسلمہ کی ضرورت ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ سنی مشترکات کیا ہیں اور کن امور میں ان کا اختلاف ہے۔ آپ لوگ اپنے اجتہادات کے ذریعے فریقین کے درمیان قربت کا سامان کرتے ہیں اور اختلافات کا شگاف ممکنہ حد تک کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کا استدلال عمیق، تفکر اور دلیل و برہان پر مبنی ہوتا ہے۔

آپ کی تالیف (اصل الشیعة و اصولها) کے نکات مجھے سب سے زیادہ

Marfat.com

عجیب لگے۔ وہ میں آنجناب کی خدمت میں عرض کروں گا اور ہر نقطے کی طرف جدا جدا اشارہ کروں گا اور ساتھ ہی آپ سے بعض ایسے مبہم نکات سے پردہ اٹھانے کی درخواست بھی کروں گا جن کے بارے میں مجھے تامل ہے۔

جناب ضیاء الدین طباطبائی جو نہایت متقی، پاکیزہ، روشن دل اور عالی دماغ شخصیت ہیں۔ آج کل سویٹزرلینڈ میں رہتے ہیں۔ ان کی جگہ ٹرین سے سفر کی صورت میں جنیوا سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ اس سال کی سردیوں میں ہم نے کئی دفعہ ایک دوسرے کی زیارت کی ہے۔ ہم ان سے بہت متاثر ہوئے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہم ان کی ذہانت، وسعت فکری اور ان کے اخلاق حسنہ کے گرویدہ ہوگئے۔ ہم آپ کو بہت یاد کرتے رہے ہیں۔ آج کے دن ہم ان کی زیارت کرنے اور ان کی جائے سکونت کوہ مونٹر دو دن گزارنے کے لیے ٹرین پر سفر کر رہے ہیں۔ اللہ اس طرح کی بہت سی شخصیات سے اسلام کو بہرہ مند فرمائے۔ عزت افزائی ہوگی اگر آپ میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا مطالعہ فرما کر آگاہ کریں اور اپنی باقی تالیفات بھی ارسال فرمائیں۔

میں حاضر العالم الاسلامی کا جدید ایڈیشن جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اگرچہ مجھے احساس ہے کہ ہیرے کا مقابلہ شیشے سے نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ گراں قیمت چیزیں شیشے سے زیادہ قیمتی ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ملتمس دعا

شکیب ارسلان

Marfat.com

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہائی کمشنر کی طرف سے ادیب الخضری کے نام انگریزی اور عربی میں ایک خط موصول ہوا جس کا متن درج ذیل ہے۔

ہائی کمشنر ریاست ہائے متحدہ امریکہ
بغداد۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء

جناب شیخ عبدالغنی الخضری
مدرس مدرسہ امام کاشف الغطاء النجف۔ عراق

آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کے دو خطوط مورخہ ۱۵، جولائی ۱۹۴۴ اور ۵، اگست ۱۹۴۴ وصول ہوئے۔ ان دونوں کا جواب تاخیر سے دینے پر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

اس تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ماہ جولائی ۱۹۴۴ء کے درمیانی ایام میں مصر کا ضروری سفر درپیش ہوا۔ آخری تین ہفتے میں نے وہاں گزارے۔ واپسی پر میں نے دیکھا کہ (ہمارے) ایک ملازم نے اصل الشیعة و اصولها نامی کتاب سے شیعہ امامیہ کے بارے میں آپ کے انتخاب کردہ اقتباسات کا ایک معیاری ترجمہ کیا ہے۔ یہ انتخاب بنیادی شیعہ عقائد کا جائزہ لینے کے لیے ایک بہترین دستاویز ہے، جو شیعہ عقائد واعمال کے بارے میں اپنی معلومات کو بہتر کرنے کی کوششوں کے دوران اب تک مجھے حاصل ہوئی ہے۔ میں اس کے عربی متن کے ایک نسخے کے علاوہ ترجمہ کا ایک نسخہ بھی واشنگٹن بھیج رہا ہوں، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ ہماری سرکاری شخصیات جو دنیا کے اس

Marfat.com

حصے کے حالات کا جائزہ لیتی ہیں، شیعوں کے بلند عقائد اور بنیادی نظریات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جامع اور مفید معلومات حاصل کریں۔ (جس طرح میں خود بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں)۔ آپ کا انتخاب اس لیے بھی قیمتی ہے، کیونکہ بغداد میں آپ کے چچا جناب حجۃ الاسلام شیخ محمد حسین کاشف الغطاء کی کتاب (اصــل الشیــعۃ و اصولھا) کو حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں، جس کا مجھے افسوس ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں آپ دونوں اور آپ کے ہم خیال دیگر فضلاء کے تعاون سے (جیسا کہ آپ کر رہے ہیں) اپنی سرزمین (امریکہ) اور عالم تشیع کے فکری زعماء کے درمیان وسیع پیمانے پر تفاہم پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

التماس ہے کہ آپ میرا عطر آگیں سلام اپنے چچا امام (کاشف الغطاء) اور ادبی ایسوسی ایشن کے ارکان تک پہنچائیں۔ مجھے امید ہے کہ میں آیندہ سال نجف کی دوسری بار زیارت کرسکوں گا اور مجھے اس تنظیم کے ارکان سے گفتگو کا شرف حاصل ہو گا۔ اس کے علاوہ آپ کی طرف سے مزید تعاون پر آمادگی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شاید مجھے آیندہ اپنے مطالعات میں آپ کی مدد درکار ہو گی۔ آپ سے توقع کرتا ہوں کہ آپ جب بغداد تشریف لائیں گے تو مجھے شرف زیارت بخشیں گے۔

آپ کا مخلص دوست

لوئی ڈبلیو اینڈ رسن

امریکی وزیر۔ ہائی کمشنر ریاست ہائے متحدہ امریکہ

بغداد

☆☆☆☆☆

Marfat.com

دارالتقریب بین المذاهب الاسلامی قاہرہ کے نام (آیت اللہ) علامہ کاشف الغطاء کا مکتوب[1]

از نجف اشرف

۸ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

و لہ الحمد

عالم مجتہد جناب تقی قمی ایدہ اللہ کے توسط سے دارالتقریب بین المذاہب الاسلامیہ قاہرہ (کے رئیس) عالم جلیل شیخ محمود شلتوت ایدہ اللّٰہ کے نام سلام وتحیات کے بعد۔ بعض اخبار و جرائد میں آپ کے بعض شائع شدہ کلمات سے آگاہ ہوا۔ یہ کلمات اللہ کی خوشنودی اور امت کے مصالح کے جذبے سے سرشار ہیں۔ پس ہم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس امت کے درمیان اس عصر میں ایسا فرد پیدا کیا جو امت کے اختلاف کو وحدت میں تبدیل کرے، دین کی حقیقت کو سمجھے اور مسلمانوں کے لیے اسلام کی برکت اور سلامتی میں اضافہ کرے۔

عرصہ پچاس سال سے ہماری یہ مسلسل کوشش رہی ہے کہ ہم اسلامی مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لائیں اور اہل توحید کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دیں۔ شاید ہماری تالیف (اصل الشیعۃ) آپ کی نظروں سے گزری ہوگی جو چھ بار

---

[1] یہ وہ خط ہے جسے مرجع دینی علامہ کاشف الغطاء طاب ثراہ نے جمعیت علماء اور دار التقریب بین المذاہب کے رکن جلیل القدر دانشور علامہ استاد محمود شلتوت ایدہ اللہ کو لکھا تھا۔ دارالتقریب بین المذاہب قاہرہ کے سکریڑی جنرل علامہ کبری شیخ محمد تقی قمی نے از راہ مہربانی ہمیں اس خط اور علامہ شیخ محمود شلتوت کے جواب کی کاپی عطا فرمائی۔ ہم یہاں پر ان دونوں خطوط کو نقل کر رہے ہیں۔ ہم علامہ محمد تقی قمی کے بے حد شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں یہ دونوں خطوط مہیا کیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کی عمر، عزت اور توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ مرتضیٰ رضوی کشمیری

Marfat.com

طباعت کے مراحل سے گزر چکی ہے۔ ایک بار قاہرہ سے بھی چھپی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے کو پڑھ کر آپ کو اور اسلام کا درد رکھنے والے ہر غیرت مند مسلمان کو سرور حاصل ہوگا۔

اللہ آپ کو کامیاب فرمائے نیز آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اس پر صحیح طریقے سے عمل کرنے کی توفیق عطا کرے۔

دعا گو

محمد حسین آل کاشف الغطاء

☆☆☆☆☆

جواب

عظیم المرتبت استاد، علامہ اکبر گرامی قدر جناب شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اما بعد دار التقریب کے اعضاء اور میرے دیگر بھائیوں کے لیے یہ بات نہایت خوشی اور سرور کا باعث ہے کہ ہمارے استاد (کاشف الغطاء) ایک قوی ترین سہارا ہیں، جن پر ہمارے ساتھی اپنے افکار کی کامیابی اور ان اہداف تک رسائی کے لیے بھروسہ کرتے ہیں، جن اہداف کے حصول کے لیے ان کی ذات گرامی کوشش کر رہی ہے۔ اس بات سے ہماری آگاہی کا باعث آں بزرگوار کا وہ جملہ نہیں جو آپ نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا ہے، بلکہ ہمیں اس کا پہلے سے علم تھا۔ اس بات نے ہمارے دلوں میں اس وقت تک جگہ بنالی تھی جب سے ہمیں استاد بزرگوار کی کتاب اور کوششوں کا علم ہوا تھا۔ ہم نے ان کی کتاب اور اس کے فصول کا مطالعہ کیا، جس کے مقدمے میں مؤلف نے آسان اور مفید انداز میں ان لوگوں کے سامنے مشرق کے اسلامی مذاہب کی حقیقت سے خوب پردہ اٹھایا ہے، جنہوں نے ان مذاہب کو ایسا تاریک لباس پہنایا ہے جو ان کی حقیقت کو چھپاتا ہے۔ انہوں نے تمام اسلامی مذاہب کے درمیان ان (مسخ شدہ تعلیمات) کی خوب ترویج کی۔ اسلام کے اندر مذاہب کی موجودگی، اس دین کے اندر موجود لچک اور نرمی کا نتیجہ ہے۔

Marfat.com

صاحب شریعت کی پالیسی یہ نہ تھی کہ لوگوں کو غیر لچکدار، احکام کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیں۔ حالانکہ تہذیبوں اور تمدنوں کا اختلاف احکام میں لچک کا متقاضی ہے نیز زمان و مکان اور انداز فکر میں اختلاف کے باعث لوگوں کے نظریات وافکار اور مصالح بھی مختلف ہوتے ہیں۔

لہٰذا اسلام نے لوگوں کو حریت فکر سے نوازا ہے نیز انہیں استنباط و استخراج اور تطبیق کی آزادی دی ہے۔ اسلام نے آزادی کی اس نعمت کو دائمی قرار دیا ہے، جب تک قرآن باقی ہے، یہ نعمت بھی برقرار رہے گی۔ وہی قرآن جو اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ اللہ نے اس کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا ہے اور اس کی ہدایت و رہنمائی سے تمسک کی دعوت دی ہے۔

یہ تھے بعض خیالات جو آپ کی اس تحریر کو پڑھ کر میرے گوشہ دل میں ابھرے جو بعض غیر ذمہ دار مسلمان جماعتوں کی خود ساختہ باتوں کے حوالے سے آپ نے لکھی تھی۔

دار التقریب (جس کی تشکیل کا سہرا میرے دانشور بھائی جناب بزرگوار سید محمد تقی قمی کے سر ہے) جو آپ کے ان مفید ارشادات اور گرانقدر آراء سے استفادہ کرنے کی زبردست آرزو رکھتا ہے، جو اس کے لیے مشعل راہ اور صراط مستقیم کا سنگ میل ثابت ہوسکتی ہیں۔

ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کی بابرکت زندگی کو دراز فرمائے اور آپ کو صحت و عافیت سے نوازے کیونکہ آپ کی صحت اور عافیت مسلمانوں کی قوت و عافیت کا موجب ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دستخط

(محمود شلتوت)

عضو جماعتی کبار العلماء و التقریب

☆☆☆☆☆

Marfat.com

اتحاد امت
اصلاح امت کی ناگزیر ضرورت

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا...[1]

کرہ ارض کے مشرق و مغرب میں موجود ہر عاقل انسان یہ بخوبی جانتا ہے کہ امت کو اتحاد و اتفاق کی اشد ضرورت ہے اور اختلاف و انتشار بہت نقصان دہ چیز ہے۔ اس حقیقت کو ہر مسلمان یوں محسوس کرتا ہے، جس طرح وہ اپنی صحت، بیماری، بھوک اور پیاس جیسی طبعی و فطری حالتوں کو محسوس کرتا ہے۔ اس آخری زمانے میں چند اصلاح پسند حضرات نے اتحاد امت کے لیے جد و جہد کی۔ انہوں نے اسلامی معاشرے کو اتحاد کی دعوت دی۔ وہ ایک ماہر استاد کی طرح پکار اٹھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک ماہر و حاذق طبیب کا کردار ادا کیا، جس نے بیماری کی تشخیص کی ہو اور دوا کا بھی تعین کیا ہو اور اپنے معینہ اور طے شدہ مقصد کو حاصل کر لیا ہو۔ ایسے ڈاکٹر کی طرح جس نے لوگوں کو خوب تیار کیا ہو اور ان کے دلوں میں شوق اور ولولہ پیدا کیا ہو تا کہ وہ اس دوا کو استعمال کریں اور انسان کے جسم کا خاتمہ ہونے سے پہلے ہی اس موذی اور مہلک بیماری کو جڑ سے کاٹ دے۔

جب اصلاح پسندوں نے پکارا تو مسلمانوں نے ان کی اس عظیم پکار کو سنا اور سمجھ لیا کہ مسلم امہ کو لاحق بیماری ان کی فرقہ بندی اور ایک دوسرے سے جھگڑنا ہے اور اس کا علاج بھی وہی چیز ہے جس کے بغیر ان کی آنے والی نسلوں کی اصلاح ناممکن

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۰۳

Marfat.com

ہے۔ شفا کا وہ نسخہ، اتفاق و وحدت ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہے۔ کینہ و عداوت کو دور پھینک دینا ہے۔ بغض و عداوت اور کینہ و دشمنی کے اسباب کو پاؤں تلے روندڈالنا ہے۔ اس عظیم مقصد اور ارفع ہدف کی خاطر سعی وکوشش کرنا ہمیشہ سے ان ہستیوں کی روش رہی ہے، جنہیں اللہ نے نور بصیرت اور پختہ ارادے کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور اس امت کی بھلائی کے لیے مخلصانہ کام کرنے کے جذبے کو ان کے دلوں میں شعلہ ور فرمایا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ سے نسل و مذہب کے امتیاز سے بالا تر ہو کر تمام مسلمانوں کو لا الہ الا اللّٰہ کے پرچم تلے متحد ہونے کی دعوت دیتے آئے ہیں۔

وہ اہل توحید کو اس عظیم امت، عروۃ الوثقیٰ (مضبوط ترین دستاویز) اور مستحکم وسیلہ کی جانب بلاتے ہیں جن سے متمسک رہنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ وہ اسلام کی مضبوط رسی سے منسلک رہنے کی دعوت دیتے ہیں، جس کا اللہ نے دستور دیا ہے۔ وہ (اسلام وقرآن کے سائے میں اتحاد امت کے) اسی عظیم مقصد کی جانب بلاتے ہیں۔ کیونکہ یہی حقیقی زندگی ہے اور امت کی نجات اسی میں مضمر ہے۔ اگر امت نے اس کے علاوہ اگر کوئی اور راہ اپنائی تو اسے ابدی ہلاکت اور دائمی موت ہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہی لوگ اتحاد کے داعی، وحدت کے مشعل بردار، حق کے علمبردار، حقیقت کے پیغام رسان اور اس زمانے میں بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ وہ اسلام کے مٹے ہوئے آثار کی تجدید کرتے ہیں اور دین محمدی کے دھند لائے ہوئے مینارۂ نور کو پھر سے بلند کرتے ہیں۔ انہی افراد (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے) کی جہد مسلسل اور سعی پیہم سے بہتری کی امید اور کامیابی کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دل و جان نے اس پاکیزہ خوشبو کی مہک محسوس کی ہے اور وہ ایک دوسرے سے نزدیک ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے (کی حقیقت) کو پہچان رہے ہیں۔ اس حقیقت کی پہلی کرن اور اس سوچ کے بیج کی پہلی نشو و نما مؤتمر عالم اسلامی کا وہ اجتماع ہے جو چند سال قبل بیت المقدس میں منعقد ہوا اور اس میں بہت سے مسلم رہنماؤں نے شرکت کی۔ انہوں نے الگ الگ مذاہب، قومیتوں اور ملکوں کے حامل ہونے کے باوجود یہ فیصلہ کیا کہ وہ اسلامی (مشترکہ) امور میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے اور باہمی اعتماد اور اخوت و برادری سے کام لیں گے۔ یہ اجتماع اپنی

Marfat.com

نوعیت کے اعتبار سے مسلم تاریخ کا پہلا اور منفرد اجتماع تھا، جس سے تمام مسلمانوں نے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک تھی تو استعماری طاقتوں کی آنکھوں میں چبھنے والا کانٹا تھا، جس کو ناکام بنانے کے لیے انہوں نے ہزاروں چالیں چلی تھیں اور اپنی بساط کے مطابق اس کے سامنے ہر دروازے کو بند کر دیا تھا۔

اگر چہ ان بزرگوں نے (اتحاد امت کے) اس ہدف کے لیے راہ ہموار کر کے اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور بڑی توجہ کے ساتھ اس ہدف کی نگہبانی کی تاکہ (امت واحدہ کے اس شجر مبارکہ) کا پھل پک کر قابل استفادہ ہو جائے اور اس کی جڑیں امت کی سرزمین میں گہرائی تک جا کر مستحکم ہو جائیں۔ لیکن ان تمام مساعی جمیلہ کے باوجود (کوئی قابل رشک نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ) عمومی طور پر ہم مسلمان ہمیشہ آرزوؤں کی رسی سے معلق رہتے ہیں، عمل کی بجائے باتوں کو کافی سمجھتے ہیں، حقائق کے بجائے ظاہری امور کے گرد محو طواف رہتے ہیں، کسی بات کی تہ تک پہنچنے کی بجائے اوپر اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ (اسی لیے اتحاد امت کے سلسلے میں ہونے والی سنجیدہ کوششیں مطلوبہ نتیجہ نہیں دے پاتیں۔) ہمارے اس رویے کے بالکل برعکس ہمارے اسلاف سعی و کوشش کے مالک تھے۔ وہ گفتار سے پہلے کردار کی سچائی کے حامل تھے۔ بات کے بجائے پختہ ارادوں کے مالک تھے۔ قوت و غلبہ کی حامل ان اعلیٰ صفات کو غیروں نے ان سے اخذ کیا تو وہ ہم سے آگے نکل گئے، جبکہ اس سے پہلے سبقت ہمیں حاصل تھی۔ ماضی میں ہم ان پر قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑتے تھے اور آج ہم ان کے زیر عتاب آ گئے ہیں۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۔[1]

ہم اتحاد و اتفاق کے اعلانات کرتے ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر تقاریر کرتے ہیں اور اس قسم کی تحریروں سے اخبارات و جرائد کے صفحات کو بھر دیتے ہیں، پھر یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم نے اتحاد کے اہم مقصد کو حاصل کر لیا ہے اور ہم ایسی زندہ قوم میں بدل گئے ہیں جس نے اپنی وحدت و یکجہتی اور عزت و عظمت کو پا لیا ہے اور وہ مقام حاصل کر

---

[1] ۳۳ احزاب : ۶۲

Marfat.com

لیا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر ہمیں تنزل کے علاوہ کچھ نصیب نہیں ہوتا اور ہماری کوششوں کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں نکلتا اور ہمارے سارے اقوال و اعمال غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ البتہ چند لمحات کے لیے ہماری سماعت ان باتوں سے لطف اٹھاتی ہے، پھر وہ سراب بن جاتی ہیں جسے صحرا کا مسافر پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہے، جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا۔ اگر مسلمان اسی حالت پر باقی رہے تو محال ہے کہ ان کا کوئی اقدام ثمرآور ہو، وہ کسی عقیدہ و عمل پر متحد ہوں یا انسانی معاشروں میں انہیں کوئی مستحکم مقام ملے، اگرچہ وہ اخبار و جرائد، زمین کے گوشہ و کنار اور آسمان کی بیکراں فضاؤں کو اتحاد و اتفاق اور ان کے مترادف الفاظ سے بھر دیں یا فصیح و بلیغ تحریر و تقریر کے گوہر پاروں سے اپنے خطاب کو مزین کیوں ہی نہ کریں۔

یہ ساری باتیں اس وقت تک کوئی کام نہیں آئیں گی جب تک مسلمان اپنے اندر بنیادی طور پر تبدیلی نہ لائیں، سنجیدہ کوشش نہ کریں اور اپنے اسلامی اخلاق و عادات کی صحیح طور پر حفاظت نہ کریں۔ اتحاد امت کے لیے نفسانی خواہشات کو لگام دینا ہوگی اور عقل و خرد، فہم و فراست اور حکمت و دانشمندی کو آزادی کے ساتھ سوچنے کا موقع فراہم کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں ہر مسلمان اس حقیقت کا ادراک کرے گا کہ اس کے مسلمان بھائی کی مصلحت اور بھلائی درحقیقت اس کی اپنی مصلحت اور بھلائی ہے۔ تب وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے لیے اس طرح کوشش کرے گا جس طرح وہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے کوشش کرتا ہے۔

یہ بات اس وقت عملی جامہ پہن سکے گی جب ایک مسلمان کا دل دوسرے مسلمان کے حوالے سے کینہ و عداوت اور حسد سے پاک ہو جائے اور ہر مسلمان دوسرے کو دشمنی اور غیظ و غضب کی نگاہ سے نہیں بلکہ اخوت و رضا مندی کی نظر سے دیکھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ انتقام و سختی سے نہیں، بلکہ شفقت و مہربانی سے پیش آئیں۔

یہ کیفیت اس وقت پیدا ہو گی جب ایک مسلمان اپنے قلب و ضمیر کی گہرائیوں سے یہ محسوس کرے کہ اس کی عزت و احترام اس کے دوسرے مسلمان بھائیوں کی عزت

Marfat.com

واحترام میں مضمر ہے۔ اس کی قوت وشوکت میں اس وقت اضافہ ہوگا جب اس کے اعوان وانصار طاقتور ہوں اور یہ جان لے کہ ہر مسلمان دوسرے کا مددگار ہے۔ تو کیا اس احساس کے بعد بھی کوئی دوسرے مسلمان کی مدد کرنے، اس کی عزت و وقار کو تقویت پہنچانے اور اس کو تحفظ فراہم کرنے میں سستی سے کام لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اگر اس اچھی صفت سے متصف ہونا ایسا سخت کام ہے جسے حاصل نہ کیا جا سکے اور ایسی بلند چوٹی ہے جسے سر کرنا ممکن نہ ہو اور کوئی مسلمان اپنے دوسرے بھائی سے مواسات نہیں کر سکتا اور اس کے لیے وہی چیز پسند نہیں کر سکتا جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے اور اپنے مفاد کو امت کے وسیع تر مفاد سے منسلک اور اپنی عزت وشوکت کو ملی وقار میں مضمر نہیں دیکھ سکتا تو کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں عدل و انصاف سے کام لے اور ایک دوسرے کو مساوی نگاہ سے دیکھے۔ یوں وہ کسی مسلمان بھائی کے حقوق کا انکار نہ کرے، انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دے اور معاملات میں نقصان نہ پہنچائے۔

(ملی وحدت اور رواداری جیسے) امور کو حاصل کرنے کا بنیادی اصول اور فارمولا یہ ہے کہ حرص و لالچ، برتری جوئی، ناروا امتیاز، حسد اور دوسروں کو پیچھے دھکیل کر خود آگے بڑھنے کی بری صفات سے نجات حاصل کی جائے کیونکہ یہ بری صفات بدبختی اور آفات و بلیات کی زنجیر ہیں جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے متصل ہیں اور ان میں سے ہر ایک صفت انسان کو دوسری بری صفت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

یوں جو بھی قوم ان بری صفات میں مبتلا ہو جائے وہ شقاوت و بدبختی کی گہری کھائیوں میں گر کر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ ان تمام زہریلے اثرات کا بیج خود کو دوسروں پر مقدم رکھنے کی خواہش ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مفادات کے حصول کے وقت خود کو دوسروں پر مقدم رکھنے سے حسد پیدا ہوتا ہے اور حسد سے عداوت، عداوت سے اختلاف، اختلاف سے انتشار اور انتشار وگروہ بندی سے ضعف و کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ ضعف، ذلت و غلامی کا باعث ہے اور اس کی وجہ سے اقتدار و سلطنت اور نعمتیں چھن جاتی ہیں اور قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ (ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات)

تاریخ بتاتی ہے نیز عقل سلیم اور مشاہدہ یہ سچی گواہی دیتے ہیں کہ جہاں کہیں

Marfat.com

بھی یہ برائیاں موجود ہوں وہاں قومیں فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، پختہ عزائم اپنی موت آپ مر جاتے ہیں، ارادے ناکام ہوتے ہیں اور اس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس مرحلے پر وہ قوم غلامی و استحصال، ہلاکت و تباہی، اجنبی لوگوں کے غلبے اور دشمنوں کی بالادستی جیسی ذلتوں سے دوچار ہوتی ہے۔

اگر کسی قوم کے افراد کے نظریات میں ہم آہنگی، ترجیحات میں مطابقت، دلوں میں الفت ہو اور وہ باہمی تعاون، فکری طور پر ایک دوسرے کی مدد اور فیصلوں میں ایک دوسرے کی تائید جیسی اچھی صفات کی حامل ہو تو ایک دوسرے کے لیے ان کے دلوں میں نفرت اور سینوں میں کینہ و عداوت نہیں ہو گی۔ وہ ایک دوسرے سے گریزاں نہیں ہوں گے اور مدد کے مواقع پر تعاون سے ہاتھ نہیں کھینچیں گے۔ ایسی حالت میں قوموں کو عزت و بقا، عافیت و خوشحالی، طاقت و غلبہ، دولت و حکومت اور شان و شوکت کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ اللہ انہیں سختیوں سے کشائش اور مشکلات سے نجات بخشتا ہے۔ ان کی ذلت و غلامی کو عزت و استحکام میں اور خوف و وحشت کو امن وامان میں بدل دیتا ہے۔ اس طرح زمانے کی حکومت و قیادت ان کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔

آج مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام سے قبل اپنے آبا و اجداد کی حالت سے عبرت حاصل کریں کہ وہ دنیا میں پست و ذلیل تھے، سختی و مشکلات میں گرفتار تھے، قوموں میں سب سے زیادہ کمزور اور بدحالی کے شکار تھے۔ انہیں نہ کسی نظریہ اور فکر کی پشت پناہی حاصل تھی اور نہ ہی مشکلات، آفات و بلیات اور ویران کن جنگوں کے شعلوں سے فرار کی گنجائش۔ جلا دینے والی لو سے بچنے کے لیے ان کے پاس کوئی سایہ بھی نہ تھا۔ زندہ درگور بچیاں، بت پرستی، قطع رحمی اور خونریزی ہی ان کی پہچان تھیں۔ جب اللہ نے اسلام کے ذریعے انہیں متحد فرمایا، توحید کے ذریعے ان کی شیرازہ بندی کی، حق کی دعوت پر مبنی ان کے پرچم کو رفعت بخشی تو رحمت خداوندی نے ان کے لیے اپنے پر پھیلا دیے، اپنی نعمتوں کے دریا بہا دیے۔ اس طرح ان کی زندگی میں بہار آئی، اتحاد واتفاق نے انہیں ناقابل تسخیر قوت و غلبہ کے قلعہ میں پناہ دی اور مستحکم حکومت و اقتدار کے اسباب و وسائل ان کے لیے رام ہو گئے۔ یوں وہ اپنی سابقہ پستی و ذلت سے نکل کر دنیا کے حاکم بن گئے اور اطراف عالم کی بادشاہی سے کھیلنے لگے اور

Marfat.com

مملکتوں کی تقدیر کے مالک بنے۔ وہ جہاں چاہتے اپنے احکام کا اجرا کرتے رہے۔ ان کے سامنے نہ کوئی اسلحہ کام آیا اور نہ ہی کوئی مشکل ٹھہر سکی۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ اس وقت مسلمان ہمہ گیر وحدت اور سچی اخوت کے حامل تھے، مسلمانوں کے مفاد اور نفع نقصان مشترک تھے اور ان کے عزم و ارادے ایک دوسرے کے موافق تھے۔ ایک مسلمان دوسرے کے حق میں مدد، تعاون اور حقوق کی رعایت کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا تھا۔

پھر حادثات زمانہ رونما ہوگئے۔ زمانہ بدل گیا۔ ایک مسلمان کو، اجنبی تو اجنبی ٹھہرے، اپنے نزدیک ترین بھائیوں سے بھی نہ صرف قطع تعلق بلکہ بدگوئی و جفا کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا اور اس سے ضرر رسانی اور خوف و دہشت کے علاوہ کسی چیز کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی ۔ اسے کسی کافر دشمن سے اتنا ڈر نہیں ہوتا تھا جتنا وہ اپنے مسلمان بھائی سے خوف کھاتا تھا۔ ان حالات میں یہ امید کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ ان کا کوئی کام سدھر جائے اور ان کو استحکام حاصل ہو جائے۔

حقیقت و واقعیت سے بہت دور کی بات ہے کہ اتحاد کے بغیر انہیں خوشحالی و سعادت نصیب ہو اور ایک دوسرے کے دست و بازو بنے بغیر وہ اتحاد و اتفاق کی نعمت سے بہرہ مند ہوں ۔ مسلمانو! جان لو کہ صرف حسین الفاظ و عبارات، چند تقاریر اور مقالات کے نشر کرنے، اخبار و جرائد کے واویلا اور قلموں کی چیخ و پکار سے تم اس اتحاد کو حاصل نہیں کر سکتے جس سے تمہارے آباء اجداد بہرہ مند تھے۔ کیونکہ اتحاد الفاظ کا کھیل تماشا، فصیح و بلیغ گفتگو کا نام نہیں، اتحاد کا معیار اور وحدت کی حقیقت، دل کا اخلاص، نیت کی پاکیزگی اور سنجیدہ سعی و کوشش ہے۔ ہمفکری اور ہم آہنگی پر مبنی عادات و صفات، کردار اور پختہ و راسخ اخلاقی کیفیت کو اتحاد کہا جاتا ہے۔ اچھے اخلاق کے ساتھ دھڑکنے والے دل، اچھے، عالی صفت اور پاک و پاکیزہ احساسات و جذبات سے وحدت وجود میں آتی ہے۔ اتحاد یہ ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے منافع کا تبادلہ کریں، انہیں فوائد میں شریک بنائیں، انصاف کے ترازو اور عدل کے اصولوں پر خلوص دل سے عمل کریں۔ مسلمان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں، اگر وہاں پر ان کی دو جماعتیں ہوں تو انہیں چاہیے کہ خود کو ایک دوسرے کے سگے بھائی سمجھ لیں جنہوں نے ایک ہی

Marfat.com

باپ سے مکان اور زمین جیسی جائیداد ارث میں پائی ہو تو وہ اسے عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کر لیتے ہیں اور ایک گروہ خود کو دوسرے پر مقدم نہیں سمجھتا کہ وہ دوسرے کے حصے ہڑپ کر لے اور دوسرے بھائی کو اس کا حق دینے میں بخل سے کام لے:

وَمَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀[1]

جن کو اپنے نفس کے لالچ سے محفوظ رکھا جائے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(ایسا اتحاد اگر وجود میں آئے) تو منافع سب کے لیے ہوں گے، فوائد اور برکات میں سب شریک ہوں گے اور حقوق و فرائض بھی یکساں طور پر سب پر لاگو ہوں گے۔ اتحاد کا معنی یہ ہرگز نہیں کہ ایک گروہ دوسرے کے حقوق غصب کر لے تو مظلوم خاموشی اختیار کرے اور نہ ہی یہ انصاف ہے کہ کوئی اپنے حقوق کا مطالبہ کرے اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم پر فریاد کرے تو ہم اسے یہ کہیں کہ تم فسادی ہو اور امت کی صفوں میں افتراق پھیلانا چاہتے ہو، بلکہ اتحاد یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے مطالبے کو سن لیں، اگر وہ برحق ہے تو اس کی مدد کی جائے، ورنہ اس کی رہنمائی کی جائے اور اسے قانع کرایا جائے۔ پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو اس سے ایک سچے دوست اور سگے بھائی کی طرح اچھے انداز میں بحث کرے اور برا بھلا کہنے، سب وشتم کرنے اور برے ناموں سے پکارنے سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے ناروا سلوک سے ان کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو انہیں خس و خاشاک کی طرح جلا دیتی ہے اور طرفین اجنبی طاقتوں کے لیے ترنوالہ بن جاتے ہیں۔

آج ایک گونگا بہرا مسلمان بھی جانتا ہے کہ عالم اسلام کے تمام ملکوں اور علاقوں میں استعمار کے ایجنٹ موجود ہیں۔ استعماری اژدھے منہ کھولے اسلامی سرزمین کے ہر خطے میں موجود ہیں تاکہ اس سرزمین اور اس کے وسائل کو لقمہ تر کی طرح نگل لیں۔ کیا یہ بات کافی نہیں کہ مسلمان متحد ہو جائیں اور ان کے اندر غیرت وحمیت کی آگ بھڑک اٹھے؟ کیا عالم اسلام کو درپیش مصائب و آلام کی سختی اور ان کٹھن حالات کے دکھ درد موجب نہیں بن سکتے کہ مسلمان باہمی عداوتوں اور کینہ و کدورتوں کا خاتمہ کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں؟ عربی ضرب مثل ہے: عند الشدائد تذهب

---

[1] ۶۴ تغابن: ۱۶

Marfat.com

الاحقاد۔ یعنی مشکلات میں کدورتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

ایک مسلمان کیسے اس لالچ میں آ سکتا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائی کو لوٹ لے یا اسے غلام بنا لے، درحالیکہ وہ قدیم زمانے سے ایک ہی علاقے کے باشندے اور ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟ دشمنوں کی طرف سے مسلسل تباہ کن مشکلات اور مصائب آسمانی بجلی بن کر گر رہے ہیں۔ کیا یہ بات مسلمانوں کو آمادہ نہیں کرتی کہ وہ آپس میں عدل و انصاف قائم کریں اور مسلم امہ کا ہر فرد معاشرتی مساوات اور سماجی انصاف کے اصولوں کی حفاظت کرے؟

ہم تو ان کوششوں کے ثمرآور ہونے اور ایک مفید اتحاد و اتفاق کے وجود میں آنے سے ذرا مایوس ہو چکے ہیں، کیونکہ مسلم سوسائٹی میں اصلاح پسندوں کی نصیحتوں اور نظریات کی قدردانی نہیں ہوتی اور ان کا کوئی مثبت اثر نظر نہیں آتا۔

جو شخص ہماری اکثر تقاریر کو سنے اور ہماری تحریروں اور ان میں مختلف دل نشین انداز میں وحدت اسلامی کی جانب دی جانے والی دعوت کا مطالعہ کرے اور دوسری طرف سے آج کل مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کا مشاہدہ کرے کہ وہ دن بدن ایک دوسرے سے کٹ کر دور ہوتے جا رہے ہیں تو وہ تصدیق کرے گا کہ میری بات درست ہے اور وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کی حالت ایسی ہے کہ گویا ہم نے ان کو ایک دوسرے سے دور ہونے اور ظلم و زیادتی کرنے کی دعوت دی ہو اور خشک گھاس کو آگ لگائی ہو۔

ہاں جو بھی شخص نشاشیبی (ایک عرب قلمکار) کی کتاب صحیح اسلام (بہت سے نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تکذیب آپ کرتے ہیں) کا مطالعہ کرے تو نتیجہ وہی نکلے گا جو اوپر ذکر ہوا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے نزدیک صحیح اسلام کا معیار یہ ہے کہ طعن و تشنیع اور تہمت و بہتان تراشی سے کام لیا جائے اور علی و فاطمہ اور حسنین کریمین علیہم السلام کی توہین کی جائے نیز ہر اس فضیلت اور منقبت کا انکار کیا جائے جن کا ذکر قرآنی آیات اور احادیث نبوی میں آیا ہے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس شخص کے نزدیک آیت تطہیر اِنَّمَا يُرِيْدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ...[1] زوجات

---

[1] ۳۳ احزاب ۳۳

Marfat.com

الرسولؐ بلکہ صرف حضرت عائشہ سے مخصوص ہے اور جگر گوشہ رسول فاطمۃ الزہرا (س) تو اس کے نزدیک یقیناً آیت تطہیر سے بالکل خارج ہیں۔ دیکھئے! اس شخص کی قرآن فہمی، اسلامی ذوق اور انصاف کس قدر حسین اور شیرین ہیں؟ اسی طرح کی بات آیت مباہلہ اور آیت ذوی القربیٰ کے بارے میں بھی کی ہے۔اہل بیتؑ کے حق میں صادر شدہ احادیث کی تو بات ہی نہیں، آیت مباہلہ اور آیت قربیٰ جیسی واضح آیات (جو ان کے حق میں نازل ہوئی تھیں) کے معانی اور مصداق کو مسخ کرنے کی اس نے مذموم کوشش کی ہے۔اس شخص کے ہاں یہ سب فضائل جھوٹ اور باطل ہیں، اگرچہ ان کے اپنے صحاح میں ذکر ہوئی ہوں۔ انکار حقائق، تہمت و بہتان تراشی، توہین اور اختلاف انگیزی کی صفات سے نشاشیبی کی طرح نصولی اور حصان وغیرہ بھی متصف ہیں۔ (ان جیسے زہریلے قلمکاروں کی موجودگی میں) کیا آپ یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے حالات سدھر جائیں گے اور ان کے انتشار کی شیرازہ بندی ہو سکے گی؟ اتحاد امت کے حوالے سے اگر میں مایوس ہوں تو کیا میں حق بجانب نہیں ہوں؟ کیا نشاشیبی اور اس کا ہم فکر طبقہ یہ نہیں جانتے کہ جب وہ شیعوں اور ائمہ اہل بیتؑ کے خلاف بہتان تراشی سے کام لیتے ہیں تو کوئی شیعہ لکھاری اس کے مقابلے میں آ سکتا ہے اور خلفاء کی عزت و شرف اور سنی مکتب فکر کے خلاف وہی زبان استعمال کر سکتا ہے جو انہوں نے شیعوں کے خلاف استعمال کی ہے؟ اسی طرح ہر مکتب فکر دوسرے کے خلاف طعن و تشنیع کی زبان کھول سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو فریقین کے ارباب عقل و دانش! ذرا سوچیے کہ مسلمان کتنی گہری کھائی میں جا گریں گے؟ اس قسم کے عمل اور ردعمل کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ رسول خدا (ص) کے اہل بیتؑ کی دوستی اور پیروی کے سوا شیعوں کا کیا گناہ ہے؟

ان تمام باتوں کے باوجود اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا اور اللہ اپنے الطاف خفیہ کے ذریعے دین و ملت کی دست گیری فرمائے گا اور وہ ہمیں ناامید ہونے نہیں دے گا۔ امید ہے کہ حمیت اسلامی سے سرشار فریقین کے ارباب عقل و خرد کو اللہ تعالیٰ اس بات کی توفیق بخشے گا کہ وہ مذموم اور زہریلے مواد نشر کرنے والوں کے خبیث ہاتھوں کو کاٹ دیں تاکہ اسلامی روح کو ختم کرنے والے زہر آلود نشریات کا خاتمہ ہو سکے۔ امید کی یہی کرن اس بات کا سبب بنی کہ ہم نے اپنی اس کتاب کی اشاعت دوم

Marfat.com

کی اجازت دے دی۔ اسی طرح ان دوسری تحریروں اور تعلیمات کی نشر و اشاعت کی اجازت دی جو مسلمانوں کو حوصلہ اور شوق دلاتی ہوں کہ وہ اتحاد امت کے اس اہم فریضہ کو انجام دینے کے لیے قیام کریں تاکہ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق مسلمان فرقوں کے درمیان سچے اور مستحکم روابط اور اخوت قائم کرنے کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کو بروئے کار لائیں۔ البتہ اس ہدف کو پانے کے لیے ان شرائط کا خیال رکھنا ہوگا:

پہلی شرط یہ ہے کہ مسلکی اور مذہبی مناظروں کا مکمل طور پر سدباب کیا جائے۔ اگر کوئی اپنے مذہب کا نام روشن کرنا چاہتا ہے تو بے شک ایسا کرے، بشرطیکہ دوسرے مذاہب کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بنائے اور انہیں برا بھلا نہ کہے۔

دوسری شرط جو اہمیت کے اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان بھائی سے قلبی لگاؤ اور سچی محبت رکھے۔ دوسرے مسلمان کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے اور گفتار کی حد تک نہیں بلکہ حقیقتاً دوسرے مسلمانوں سے کینہ و عداوت اور حسد و نفرت رکھنے سے پرہیز کرے۔ شخصی مفاد اور ذاتی مصلحتوں کی خاطر صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہ کرے، جیسا کہ آج کل تمام مسلمانوں پر یہی کیفیت حاکم ہے۔

حقیقی اتحاد اور صحیح برادری (جو اسلام کی برکت سے وجود میں آئی اور ترقی یافتہ قوموں نے اس پر عمل کیا اور وہ طاقت وعزت کی چوٹی پر فائز ہوئیں۔) اس لیے امت کا ہر فرد یہ سوچے کہ اجتماعی مفاد میں ہی شخصی مفاد مضمر ہے، بلکہ اجتماعی مفاد اس کے اپنے شخصی مفاد سے بالاتر بھی ہے۔ یہ بات زبان پر آسان لیکن میزان عمل میں بہت وزنی ہے اور عمل کی منزل سے دور ایک ایسی چیز ہے جسے ہم مسلمان محال سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ایسے فرقوں کے درمیان اتحاد جو ایک دوسرے کو دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔ یہ لوگ اگر ایک دوسرے سے اچھی گفتگو بھی کریں تو یہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ دوسرے کو دھوکہ دیں، کسی حقیر مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی سے کام لیں یا کسی کا مال چھیننے، حقوق سلب کرنے اور دوسروں پر تسلط جما کر انہیں غلام بنانے کے لیے اس ظاہر سازی سے کام لیں۔

اس طرح مسلمان کینہ توزی اور دشمنی میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ کسی نصیحت

Marfat.com

کرنے والے کی نصیحت، کسی روکنے والے کی چیخ و پکار اور کسی مبلغ کا دلنشین پند و موعظہ انہیں اس عمل سے نہیں روک سکتا اور ان کے سامنے یہ سب امور اپنی تاثیر کھو چکے ہیں۔

مسلمان اپنے سخت دشمنوں کو بھول چکے ہیں جو ان کی گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں اور تمام مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور دشمنی کا بیج بوئیں تاکہ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہیں اور وہ اپنے مکر و فریب کا جال بچھا کر مسلمانوں کو شکار کرسکیں۔ ہر سمت اور ہر جہت پھیلائے ہوئے اس سازشی جال سے مسلمان محفوظ نہیں رہ سکتے مگر یہ کہ وہ صرف باتوں کی حد تک نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے پختہ ارادے کے ساتھ عملاً متحد ہو جائیں۔ آگاہانہ اور عملی اتحاد کی اس سوچ کو عملاً پروان چڑھانے اور اس منزل کو پانے کا قریب ترین ذریعہ یہ ہے:

۱۔ ہر سال یا دو سال میں مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماع ہو جس میں اسلامی سرزمین کے تمام گوشہ و کنار سے ارباب عقل و خرد اور علماء و دانشور شرکت کریں تاکہ ایک دوسرے کا تعارف ہو اور وہ عالم اسلام کے مختلف امور کے بارے میں سنجیدہ گفتگو کرسکیں۔

۲۔ مسلمان سربراہان مملکت (اگر واقعاً کوئی سربراہ ہو) اور اسلامی ملکوں کے درمیان (ہر شعبے میں باہمی تعاون کے) معاہدے ہوں اور کانفرنسیں منعقد کی جائیں تاکہ وہ ید واحدہ بن سکیں بلکہ ایک جسم کے دو ہاتھوں کے مانند بن جائیں جو بدن کو درپیش خطرات کا مشترکہ مقابلہ کرتے ہیں۔ جنگ عظیم اول و دوم کے بعد ان پر بہت سے ناخوشگوار حوادث آئے ہیں جن میں واضح عبرتیں اور دلنشین اسباق موجود ہیں بشرطیکہ کوئی عبرت لینے والا موجود ہو۔

بس اس قدر تبلیغ و دعوت، انداز اور ہوشیار باشی ہمارے لیے کافی ہے۔

اس کتابچے کو مزید مفید بنانے کے لیے ہم نے طبع اول میں رہ جانے والے بعض نقائص کو دور کر دیا ہے اور بعض مقامات پر کچھ ضروری اضافات بھی کیے ہیں تاکہ موضوع بحث مکمل طور پر واضح ہو جائے۔ اس کے ساتھ شدت سے اس بات کا خیال

Marfat.com

بھی رکھا گیا ہے کہ اختصار سے کام لیا جائے اور بنیادی مقاصد تک قاری کے ذہن کو پہنچانے کے لیے قریب ترین راستہ اختیار کیا جائے تا کہ کتاب کا مطالعہ اور اس کا سمجھنا ہر طبقے کے قاری کے لیے آسان ہو۔

اس زمانے میں لوگ دور دراز علاقوں تک جانے کے سخت اور مشکل راستوں کو چند گھنٹوں میں طے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جبکہ یہ راستے سابقہ زمانوں میں کئی دنوں، بلکہ مہینوں میں طے ہوتے تھے۔ اس لیے بات کو طول دینا اس دور کے انسان کے ذوق سے مناسبت نہیں رکھتا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے موضوع کا مکمل احاطہ کر لیا ہے اور نہ ہی خود کو خطا و کمی سے پاک سمجھتا ہوں۔ میرے لیے یہ کافی ہے کہ حسن نیت کے ساتھ اپنی بساط کے مطابق اپنی شرعی ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اور اس کے لیے نئے موضوع کا انتخاب کیا ہے اور جدید اسلوب اپنایا ہے۔

ہمارے معاصر اور بعد میں آنے والے علماء وفضلا اگر چاہیں تو وہ اس بحث کو مزید پھیلا سکتے ہیں ۔ہم نے تو اس کی ابتدا کی ہے اور ایک ایسی راہ انہیں دکھائی ہے جس میں نہ تو کجی ہے اور نہ ہی کوئی پھسلن۔ اس کے علاوہ یہ رویہ موجودہ زمانے کے تقاضوں سے زیادہ نزدیک بھی ہے اور اس اسلوب بیان سے بھی زیادہ قریب ہے جس کے ذریعے کسی مذہب کی عیب جوئی کیے اور کسی کی عزت و شرف کو ٹھیس پہنچائے بغیر حقائق کو ان کی اپنی اصلی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ البتہ کسی حد تک مأخذ و منابع اور ادلہ و براہین کی طرف بھی مختصر اور خفیف سا اشارہ کیا ہے۔

وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ انیب

محمد حسین آل کاشف الغطاء

۱۵ ربیع الآخر ۱۳۵۵ ہجری

☆☆☆☆☆

Marfat.com

وجہ تالیف

دو برس پہلے کی بات ہے، دیار مصر سے ایک عراقی طالب علم کا خط آیا۔ مکتوب خاصا طویل اور اس کا ماحصل یہ تھا :

نامہ نگار نے جامعۃ الازھر کے بڑے بڑے علماء سے تبادلہ خیال کیا۔ نجف اشرف اور اس دانشگاہ کے علماء، پڑھنے پڑھانے کے طریقوں، تحصیل علم کے لیے دور دراز سے ہجرت کر کے وہاں پہنچنے والوں، نیز مشہد علوی کی روشن فضا سے لو لگانے والوں کا بھی ذکر آ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ قاہرہ کے علمی حلقے جامعۃ العظمی نجف کی جی بھر کر تعریف کرتے ہیں اور یہاں کے افاضل کی ذہنی بلندیوں سے بھی کافی متاثر ہیں، مگر اس کے باوجود یہ ضرور کہتے ہیں : ہائے افسوس ! وہ شیعہ ہیں!

خط لکھنے والے کا بیان ہے کہ مجھے اس پر بڑا تعجب ہوتا تھا اور اکثر ان حضرات کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ صاحبو ! شیعہ بھی اسلامی فرقوں میں سے ایک اسلامی فرقہ اور مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ملتا:

نہیں جناب ! شیعہ مسلمان نہیں ۔تشیع کا اسلام سے کیا تعلق؟ بلکہ اسے تو مذاہب و ادیان میں شمار کرنا ہی غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو ایرانیوں کی ایک اپج اور اموی حکومت کو عباسی شہنشاہیت میں بدلنے کا ایک سیاسی ڈھونگ تھا۔ اسے خدا کے بنائے ہوئے راستوں سے کیا واسطہ!

بعد ازاں یہ نوجوان تحریر کرتا ہے:

Marfat.com

جناب والا ! میں ابھی کم سن ہوں اور ادیان کی ابجد سے بے خبر۔ نہ مجھے ادیان و مذاہب کے بڑھنے چڑھنے کا فلسفہ معلوم ہے اور نہ ان کے پھلنے پھولنے کی تاریخ سے واقف ہوں۔ بنا بریں کچھ شکوک پیدا ہو چلے ہیں اور کیوں نہ ہوں، اس لیے کہ جن بزرگوں سے مجھے گفتگو کا موقع ملا، وہ بڑے پائے کے عالم ہیں۔

یہ جملے لکھ کر مصر کی اعلیٰ درس گاہ (ڈگری کالج) کے اس طالب علم نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اسے ذہنی کشمکش سے چھٹکارا دلاؤں پھر بڑے اصرار کے ساتھ یہ لکھا:

اگر التجا رایگاں گئی اور میں راہ سے بے راہ ہوگیا تو جناب ذمہ دار ہوں گے!

چنانچہ میں نے جواب ضروری سمجھا اور ایک خط میں جتنا مطلب آ سکتا تھا اور اس کی فہم کے مطابق جو مضمون سما سکتا تھا، وہ لکھ کر بھیج دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے:

اس نوجوان کو جتنے شبہات تھے اس سے زیادہ مجھے حیرانیاں! سوچتا تھا کہ یہ بات کیسے صحیح مان لی جائے۔ مصر جیسا متمدن ملک، اسلامی علوم کا گہوارہ، عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کا مرکز نظر اور وہاں کے دانشمندوں کے جہل و عناد کا یہ عالم!! کسی طرح یقین نہیں آتا تھا۔

مگر اتفاقاً انہی دنوں مشہور قلم کار احمد امین کی وہ کتاب ہاتھ آ گئی جس کا نام فجر الاسلام ہے۔ میں اس کا مطالعہ کرتا رہا، لیکن جب شیعوں کے حالات تک پہنچا تو رنگ نگارش دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ فاضل مؤلف کتاب کیا لکھ رہے ہیں، ہوا میں محل کھڑے کر رہے ہیں۔ عہد حاضر میں بھی اگر چین[1] کے دور و دراز علاقوں کا کوئی آدمی ایسی غیر ذمہ دارانہ تحریر پیش کرتا تو اسے بھی آسانی سے معاف نہ کیا جاتا۔ خیر اس سے

---

[1] ستمبر ۱۹۸۰ء میں مجھے چین جانے کا موقع ملا۔ پیکنگ، شنگھائی، کینٹن اور سنکیانگ وغیرہ۔ جہاں کہیں بھی پہنچا وہاں بڑے سلجھے ہوئے لوگ ملے۔ میں نے شمالی امریکہ، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر علاقے دیکھے ہیں اور تقریباً پوری دنیا کے مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے مگر چین جیسے پیارے مسلمان بہت کم نظر آئے۔ ⇦

Marfat.com

مجھے اطمینان ہوگیا کہ عراقی طالب علم نے جو کچھ لکھا تھا، وہ بالکل درست تھا اور معاً یہ خیال دامن گیر ہوا کہ جب احمد امین جیسے شوق تصنیف رکھنے والوں کے ذہن وفکر کا یہ نقشہ ہے تو ناخواندہ یا نیم خواندہ عوام کی کیا کیفیت ہوگی؟ حالانکہ وقت کو دیکھتے ہوئے آج کا ہر مسلمان وحدت و اخوت کا حامی ہے نیز اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ اگر امت محمدی کا شیرازہ بکھر گیا تو زندگی بھلی نہ موت!

سچ کہتا ہوں اگر ہمارے مسلمان بھائی مذہب شیعہ کی حقیقت سے آگاہ ہوتے اور انصاف بھی کر سکتے تو ایسے لٹریچر کا وجود ہی نہ رہتا، جس سے عداوت باہمی کی طرح پڑے، نیز استعماری طاقتوں اور بے دین عناصر کی مرادیں پوری ہوں۔

اب ذرا فجر الاسلام کی اس عبارت پر غور کیجیے اور ردعمل کا اندازہ فرمایئے۔ صفحہ ۳۳۰ پر تحریر ہے:

حق تو یہ ہے کہ تشیع اسلام کو برباد کرنے والوں کی پناہ گاہ تھا۔۔الخ

لکھنے والا نادان نہیں، وہ جانتا ہے کہ ناقدوں کے قلم تعاقب کریں گے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس جارحانہ روش سے ایک ایسی قوم کے جذبات مجروح ہوں گے جو کروڑوں کی تعداد میں اور اسلامی دنیا کی بہت بڑی قوت ہے۔

ہاں! یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ سال[1] تمیں اساتید و تلامیذ پر مشتمل، مصر کا جو علمی اور ثقافتی وفد یہاں آیا تھا، اس میں احمد امین صاحب بھی شامل تھے۔ وفد کے تمام ارکان میرے ہاں بھی تشریف لائے۔ رمضان کا مہینہ تھا، رات کا وقت اور بھری ہوئی محفل۔ احمد امین کو دیکھتے ہی فجر الاسلام یاد آ گئی۔ کیونکہ یہ کتاب متعدد علماء کی نظر سے گزر چکی تھی، چنانچہ ہم لوگوں نے شکوہ کیا۔ مگر بمقتضائے شرافت بہت دبے لفظوں اور اتنے نرم لہجے میں کہ کہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔

اس پر احمد امین نے جو سب سے بڑا عذر پیش کیا وہ تھا عدم واقفیت اور

☆ سنکیانگ صوبے میں طرفان نام کا ایک تاریخی شہر ہے جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہاں کے علمائے دین کو اگر مثالی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ختن اور کاشغر کی وادیاں اسی صوبے میں ہیں جن کے سرسبز و شاداب دامن میں شیعوں کی خاصی آبادی ہے۔ نجفی

[1] ۱۳۴۹ھ

Marfat.com

کتب کی قلت۔ اس پر ہم نے کہا:

جناب جب کسی موضوع پر قلم اٹھتا ہے تو پہلے متعلقہ مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ پھر پوری طرح اس کی چھان بین ہوتی ہے۔ ورنہ قلمکار کو وہ موضوع چھونے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ ملاحظہ فرمایئے! شیعوں کے کتب خانے کیسے بھرپور ہیں۔ خود ہمارے ہی مکتبہ کو دیکھ لیجیے تقریباً پانچ ہزار جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں بیشتر کتب اہل سنت کی ہیں۔ پھر یہ علمی ذخیرہ نجف جیسے مختصر سے شہر میں، اور مصر اپنی قابل لحاظ وسعتوں کے باوجود شیعی لٹریچر سے خالی؟!!

ہاں! یہ لوگ شیعوں کے بارے میں جانتے کچھ نہیں، مگر لکھتے سب کچھ ہیں اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عراق کے برادران اہل سنت پڑوس میں رہتے ہوئے بھی شیعوں سے ناواقف ہیں!

چنانچہ چند ماہ قبل بغداد کے ایک ہونہار شیعہ سید زادے نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ حال ہی میں ضلع دلیم[1] جانے کا اتفاق ہوا۔ اس علاقے کے اکثر باشندے سنی ہیں۔ راقم نے ان سے میل جول بڑھایا، ان کی محفلوں میں حصہ لیا۔ چونکہ ولیم والے مجھ غریب شہر کے ادب و تہذیب سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے، اس لیے انھوں نے آنکھیں بچھا دیں۔

مگر جب یہ معلوم ہوا کہ جس شخص میں دلچسپی لے رہے ہیں، وہ شیعہ ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہائے! شیعہ! علم و تدین تو درکنار، ہم تو سمجھتے تھے کہ اس فرقے کے لوگ تمدن اور ثقافت کی معمولی روشنی سے بھی محروم ہوں گے ۔ بالکل جنگلی، نرے وحشی! یہ تھے ہمارے بارے میں ان کے تصورات!

خط کے آخر میں، اس نوجوان نے میری حمیت سے خطاب کیا ہے:

تا کہ میں اپنی قلمی مساعی سے غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے شیعیت کا صحیح تعارف کراؤں۔

---

[1] یہ ضلع بغداد سے متصل ہے۔

Marfat.com

کچھ عرصہ بعد یہی نوجوان موسم گرما گزارنے کے لیے شام پہنچا، وہاں سے مصر چلا گیا۔ قاہرہ سے اس نے پھر ایک تحریر روانہ کی، جس کا خلاصہ یہ تھا:

> مصر کی حالت بھی دلیم سے مختلف نہیں یہاں بھی شیعوں کے متعلق وہی خیالات عام ہیں۔ لہٰذا التجا کی جاتی ہے کہ جناب اولین فرصت میں اپنا فرض ادا فرمائیں۔ یقین مانیے! جمہور اسلام نے شیعوں کی بابت جو خیالات قائم کر رکھے ہیں وہ بے حد کریہ ہیں!

پھر اسی پر کیا منحصر! مصر و شام وغیرہ کے جرائد میں آئے دن جو بہتان تراشیاں ہوتی رہتی ہیں[1] کیا وہ کچھ کم اندوہناک ہیں؟ حالانکہ شیعوں کا صحیفۂ عقائد دامن یوسفؑ کی طرح بے داغ ہے۔ مگر جہل و عصبیت کا کیا علاج؟

الغرض ان بدعنوانیوں کے مقابلے میں خاموشی ظلم صریح کے مترادف تھی۔ لہٰذا مجھے ادائے فرض کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ مگر یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ نہ تو مجھے شیعوں کی طرف سے دفاع کرنا مقصود ہے اور نہ سواد اعظم کی افترا پردازیوں کا جواب دینا چاہتا ہوں، بلکہ سب سے بڑا مدعا یہ ہے کہ عام اسلامی حلقوں سے جہالت کی تاریکی دور ہو اور سچائی کے راستے اچھی طرح دکھائی دینے لگیں نیز عناد رکھنے والوں کے لیے حجت پوری ہو جائے اور ایوان تشیع کے نقش و نگار واضح ہو جائیں۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا ازالہ ممکن ہو سکے، تاکہ احمد امین جیسے لکھنے والوں کو پھر کبھی تخریبی کاروائیوں کا موقع ہاتھ نہ آئے۔ فجر الاسلام کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

> حق یہ ہے کہ تشیع ان لوگوں کی پناہ گاہ تھا جو کینہ اور عداوت کی وجہ سے اسلام کو برباد کرنے کے آرزومند تھے یا پھر ان لوگوں کے سر چھپانے کی جگہ تھی جو اپنی آبائی تعلیم میں یہودیت، نصرانیت اور زردشتیت کا داخلہ چاہتے تھے!
>
> اس کے بعد رقم ہے:
>
> چنانچہ رجعت کا اقرار یہودیت کا ظہور ہے! نیز شیعوں کا عقیدہ یہ

---

[1] القاموس المحیط ۴: ۲۸۸

Marfat.com

ہے کہ مجموعی حیثیت سے آگ ان پر حرام ہے! یہودی بھی یہی کہتے ہیں:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ[1]

جہنم کی آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو نہیں سکتی۔

اگر دوزخ کی سزا ہمیں ملے گی بھی تو بس چند روز۔ مسیحیت نے یوں جلوے دکھائے کہ بعض شیعوں نے امام کو ذات باری سے بالکل وہی نسبت دے دی جو مسیح کے لیے تجویز کی جاتی ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ امام لاہوت اور ناسوت کا سنگم ہوتا ہے[2] نیز نبوت و رسالت کا سلسلہ ابدی طور پر ناقابل انقطاع ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو لاہوت سے پیوست ہو جائے وہ نبی ہے۔ اس کے علاوہ تناسخ ارواح، تجسیم خدا اور حلول وغیرہ جو برہمنوں، فلسفیوں اور مجوسیوں کے قدیمی عقائد ہیں، ایک ایک کر کے شیعہ مذہب میں نمودار ہوئے ...تا آخر!

فضا مکدر ہوگی نیز دنیا ہمیں واعظ غیر متعظ قرار دے گی، اس لیے گفتگو میں تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتے، ورنہ یہ بتانا بہت آسان تھا کہ اسلام کو غیر اسلامی طریقے اختیار کر کے بربادی کا منہ دکھانے والا کون ہے؟ نیز اس وقت بھی وحدت دینی کس کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے، مگر نہیں!

البتہ صاحب فجر الاسلام سے اتنا ضرور دریافت کریں گے کہ دانشمند محترم! شیعوں کے کس طبقہ نے اسلام کو تاراج کرنے کی ٹھانی تھی؟ طبقہ اول جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چنے ہوئے اصحاب ہیں۔ جیسے سلمان محمدیؓ (فارسی)، ابو ذر غفاریؓ، مقدادؓ، عمارؓ، خزیمۃ ذوالشہادتینؓ، ابو التیہانؓ، حذیفۃ یمانیؓ، زبیرؓ، فضلؓ بن عباس اور ان کے برادر عالی قدر عبد اللہؓ بن عباس، ہاشمؓ بن عتبۃ مرقال، ابو ایوب انصاریؓ اور ابانؓ نیز ان کے بھائی خالدؓ، فرزندان سعید بن العاص اموی، سید القراء ابی بن کعب اور انس بن الحرث[3] جنہوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

Marfat.com

تھا کہ میرا فرزند حسین علیہ السلام اس زمین پر شہید ہوگا جسے کربلا کہا جاتا ہے۔ پس تم میں سے جو بھی اس حادثہ کے وقت موجود ہو، وہ ضرور اس کی مدد کو پہنچے۔ چنانچہ انس نے دسویں محرم کو جام شہادت نوش کیا۔[1] ملاحظہ فرمائیں الاصابة اور الاستیعاب۔ زندگانی صحابہ کے موضوع پر یہ دونوں کتابیں سوادِ اعظم کی مستند ترین مؤلفات میں شمار ہوتی ہیں۔

اگر ہم شیعہ اصحاب کی فہرست مرتب کرنے لگیں نیز ان کا تشیع ثابت کرنا شروع کر دیں تو اس کے لیے ایک مستقل اور ضخیم کتاب درکار ہو گی۔ پھر علمائے شیعہ کی مساعی جمیلہ سے اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔

اس سلسلہ میں السلافة جیسے علمی شاہکار اور طراز اللغة[2] جیسی معیاری فرہنگ کے مصنف سید علی خان کا زریں شاہکار الدرجات الرفیعة فی طبقات الشیعة کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔[3] اگرچہ مرحوم نے طبقات میں بنو ہاشم کے نامی گرامی افراد جیسے حمزہ، جعفرؓ اور عقیلؓ وغیرہ کے بعد صرف مشہور مشہور اصحاب کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً وہ بزرگ جن کے نام ہم لکھ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ عثمان بن احنفؓ، سهل بن حنیفؓ، ابو سعید خدریؓ، قیس بن سعد بن عبادةؓ رئیس انصار، بریدةؓ، براءؓ بن مالك، خبابؓ بن الارت، رفاعة بن مالك الانصاریؓ، ابی الطفیل عامر بن واثلةؓ، هند بن ابی هالةؓ، جعدة بن هبیرةؓ المخزومی اور ان کی والدہ ام هانی بنت ابی طالبؓ اور بلال بن رباحؓ مؤذن وغیرهم۔

مگر خیال پڑتا ہے کہ ہم نے اصابہ، اسد الغابة اور استیعاب جیسے ترجمان صحابہ کے مجموعوں سے تقریباً تین سو شیعہ اصحاب کبار کے اسمائے گرامی جمع کیے تھے اور ممکن ہے کہ کوئی صاحب نظر اس سے بھی زیادہ طویل فہرست مرتب کر لے۔

☜ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں یہ حدیث بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو ج ۱ ص ۳۰ اور رازی کی الجرح والتعدیل ج ۱ ص ۲۸۷۔ نجفی

[1] الاصابہ ۱: ۱۵۹۔ الاستیعاب بهامش ۱: ۱۲۳۔ [2] الذریعة ۱۵: ۱۵۷، ۱۰۳۵۔

[3] اس سلسلے میں علامہ سید محسن الامین کی انسائیکلوپیڈیائی تصنیف اعیان الشیعة خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب ۵۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ تین جلدوں کا ترجمہ ان کے فرزند رشید اور میرے محترم دوست دانشمند گرامی الاستاذ سید حسن الامین نے انگریزی میں بھی شائع کر دیا ہے۔ نجفی

Marfat.com

لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا یہی اکابر اسلام کو برباد کرنے کے آرزومند تھے یا شیعوں کے امام علی بن ابی طالب علیہ السلام؟ جن کے لیے ثقلین گواہ ہیں کہ اگر وہ بدر، احد اور حنین و احزاب میں اپنی تیغ آب دار کو علم نہ کرتے تو نہ شجر اسلام کی کوئی شاخ ہری ہوتی اور نہ اس کاخ بلند کا کوئی ستون قائم نظر آتا۔ اس لیے کہنے والے نے کہا ہے:

بنی الدین فاستقام و لو لا
ضرب ماضیہ ما استقام البناء

نیز عبدالحمید معتزلی نے تو غلو کی حدیں توڑ دیں۔ فرماتے ہیں:

الا انما الاسلام لو لا حسامہ.....۔

ان کی تلوار نہ ہوتی...

جی ہاں! اگر ذوالفقار حیدری کی برق باریاں اور ہجرت سے قبل و بعد شیر کردگار کے زہرہ گداز اقدامات، نیز مکہ میں مشکل کشا کے والد گرامی حضرت ابوطالبؑ کی پرزور اور بے لوث حمایت، علاوہ ازیں سرزمین حرم اور ارض یثرب پر خود علی مرتضیٰ علیہ السلام کی غیر معمولی امداد شامل حال نہ ہوتی تو قریش کا سرکش گروہ اور عرب کے خونخوار بھیڑیے ابتدا ہی میں اسلام کا کام تمام کر دیتے۔

لیکن مسلمانوں نے ابوطالبؑ کے احسانات کا یہ صلہ دیا کہ آپ کو دم آخر بھی مسلمان قرار دینے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے اور اس کے برعکس نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے تمام مصائب کی بنیاد یعنی ابوسفیان کو خلعت اسلام سے نوازنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں! حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس نے انتہائی جبر و اکراہ کے ساتھ اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کو جب خلافت نصیب ہوئی ہے تو ابوسفیان ہی نے چیخ کر کہا تھا:

تلقفوھا یا بنی امیة تلقف الکرة فو الذی یحلف بہ ابو سفیان ما من جنة و لا نار۔[1]

فرزندان امیہ! خلافت کو گیند کی طرح گوچ لو۔ میں جس کی قسم کھا سکتا ہوں اسی کی سوگند کہ نہ بہشت ہے نہ دوزخ!

---

[1] الاستیعاب ۴: ۸۷، مروج الذہب ۳: ۸۶۔

Marfat.com

بہر حال! جمہور کے فیصلے کے مطابق یہ زبان دراز تو مسلمان کہا جائے اور ابو طالبؑ! اسلام کا بزرگ ترین معاون جن کے معتقدات کی ایک ہلکی سی جھلک ان کا یہ شعر ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِیْنَ مُحَمَّدٍ — مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّةِ دِیْنَا[1]

میری دانست میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین یقینی طور
پر تمام ادیان عالم میں سب سے اچھا دین ہے۔

سبحان اللہ! یہ کہنے والا غیر مسلم سمجھا جائے؟ حالانکہ ابو طالب نہ ایسے بے دست و پا تھے اور نہ اتنے ضعیف الرائے کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے، اس کی پیروی نہ کرتے اور وہ بھی محض عوام کے خوف سے۔ واضح رہے کہ آپ بطحا کی تمام قوتوں اور جملہ توانائیوں کا مرکز تھے۔

خیر آیئے تھوڑی دیر کے لیے حکایات تخریب اسلام کا جائزہ لیں۔ اچھا! تو یہ مخرب دین تھے، جن کا ابھی تذکرہ ہو رہا تھا یا ان کے بعد کا طبقہ، جسے گروہ تابعین کہا جاتا ہے اور جس میں احنف بن قیس، سوید بن غفلة، عطية العوفی، الحکم بن العتيبة، سالم بن ابی الجعد، علی بن الجعد، الحسن بن صالح، سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، الاصبغ بن نباته، سلیمان بن مهران الاعمش اور یحییٰ بن یعمر العدوانی صاحب الحجاج[2] وغیرہم شامل ہیں۔

ان کے بعد تبع تابعین کی وہ سربرآوردہ شخصیات ہیں جنہوں نے علوم اسلامی کی تأسیس کی۔ جیسے ابی الاسود دؤلی واضع علم نحو، الخلیل بن احمد موجد فرهنگ و عروض، ابو مسلم معاذ بن مسلم الهراء مؤسس علم الصرف، جن کی شیعیت کا اعتراف سیوطی نے بھی کیا ہے[3] اور عربی ادب کے پیشوا یعقوب بن اسحاق السکیت نیز مفسرین کی جماعت میں امت کے عظیم دانشور جناب عبد الله بن عباس کا اسم گرامی سرفہرست ہے اور ان کا تشیع مہر نیم روز سے بھی زیادہ روشن ہے۔ ان کے بعد جابر بن عبدالله الانصاریؓ، أبی بن کعبؓ، سعید بن جبیرؓ، سعید بن المسیبؓ اور علوم قرآن کے اولین جامع مفسر محمد بن عمر

---

[1] ابو طالب [2] الفوائد ۱:۳۵۷ [3] المزهر ۲: ۴۰۰

Marfat.com

الواقدی کے نام آتے ہیں۔ ابن الندیم نے ان کے شیعہ ہونے کا اقبال کیا ہے۔ الرغیب واقدی کی تفسیر ہے۔[1]

علم حدیث کی بنیاد رکھنے والوں میں سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور کتاب الاحکام و السنن والقضایا کے مصنف ابو رافع ہیں۔ یہ امیرالمومنین علیہ السلام سے خصوصی ربط رکھتے تھے نیز حضرت علیہ السلام کے دور حکومت میں مرکزی خزانہ عامرہ کے معتمد مالیات تھے۔ان کے فرزند بھی اسی سلسلے کے دونمایاں افراد ہیں۔ علی بن ابورافع امیرالمومنین علیہ السلام کے سیکریٹری تھے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے باپ کے بعد فقہ میں تصنیف کا کام کیا اور ان کے بھائی عبد اللہ بن ابورافعؒ[2] جنہوں نے تاریخ و وقائع نگاری کی بھی طرح ڈالی۔[3]

جن حضرات نے علم کلام کی عمارت کھڑی کی ان میں ابو ھاشم بن محمد بن الحنفیۃ کو اولیت حاصل ہے۔اس موضوع پر ان کی متعدد جلیل القدر کتب کا نشان ملتا ہے۔ پھر عیسیٰ ابن روضۃ التابعی کے کارنامے سامنے آتے ہیں جو امام ابی جعفر علیہ السلام تک موجود تھے۔ واضح رہے کہ مذکورہ اعاظم، واصل بن عطاء اور ابو حنیفۃ سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ اس ضمن میں سیوطی کا یہ خیال درست نہیں کہ مؤخر الذکر علم کلام کے اولین مصنف تھے۔

بعد ازاں مشہور شیعی اکابر کا دور آتا ہے جن میں قیس الماصر، محمد بن علی الاحول معروف بہ مومن الطاق اور آل نوبخت شامل ہیں۔ یہ گرامی مرتبت خاندان سو سال سے زیادہ عرصہ تک مذہب و ملت کی خدمت نجام دیتا رہا۔ ان کی تصنیفات میں فص الیاقوت وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے نیز ھشام بن الحکم، الاحول، الماصر اور ان کے تلامیذ جیسے ابو جعفر البغدادی السکاک، ابو مالک الضحاک الخضرمی، ھشام بن سالم اور یونس بن یعقوب وغیرہم کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

---

[1] فہرست ابن ندیم: ۱۹۴

[2] تاسیس الشیعۃ: ۲۸۳، و ۲۹۸۔ رجال النجاشی: ۲۱۶۔ رجال ابن داؤد: ۱۳۴، ۱۰۱۱۔ تنقیح المقال ۲: ۲۶۳۔ الکنی و الالقاب ۱: ۴۷۔ الخلاصۃ: ۱۰۲: ۶۸۔ اعیان الشیعۃ ۸: ۱۵۱۔

[3] تاسیس الشیعۃ: ۲۳۲ و ۲۸۱۔ تنقیح المقال ۲: ۲۳۷۔ فہرست طوسی: ۱۰۷، ۴۶۶۔ الخلاصۃ: ۱۱۲: ۲۔ رجال الطوسی: ۴۷: ۱۷۔ الکنی و الالقاب ۱: ۴۷ تہذیب التہذیب ۷: ۱۱۔

Marfat.com

یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے دوسرے مسلمان مذاہب کے علماء اور غیر مسلموں میں سے دہریوں سے تبادلہ فکر ونظر کر کے انہیں زبردست ذہنی شکستیں دیں اور توحید و امامت جیسے عناوین کے لیے ناقابل تردید ثبوت مہیا فرمائے۔ اگر کوئی شخص ان حضرات کے جملہ کلامی مباحث کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو ہمارے علمی ذخائر کی زینت ہیں تو ہر متکلم کی افادات کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔ خصوصاً ہشام ابن حکم کے مناظرات! اسی طرح اگر ہم تمام شیعہ فلاسفہ اور متکلمین کا شمار کرنا چاہیں تو کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں گی۔

اب فرمائیے فجر الاسلام کے مصنف صاحب! یہ لوگ دین خدا کی تباہی کے خواہشمند تھے یا وہ ہوشمند تھے جنہوں نے سیر و آثار کی حفاظت میں رات دن ایک کر کے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی، معجزے، غزوات اور حسن کردار کے نمونوں کو جمع کرنے کی سعی فرمائی؟ اس زمرے میں عالم اسلام کی پہلی شخصیت ابان بن عثمان الاحمر تابعی[1] امام جعفر صادق علیہ اسلام کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد هشام بن محمد ابن السائب الکلبی، محمد بن اسحاق المطلبی اور ابو مخنف الازدی کے شاہکار سامنے آتے ہیں۔ بعد کے تمام لکھنے والے اس فن میں ان کے محتاج رہے اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ بزرگان صف اول کے شیعوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مؤرخین کی فہرست پر نگاہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کل بلند پایہ قلم کار اور مؤرخین شیعہ تھے۔ مثلاً کتاب المحاسن کے مؤلف احمد بن محمد بن خالد البرقی، نصر بن مزاحم المنقری، ابراهیم بن محمد بن سعید الثقفی، عبدالعزیز الحلودی البصری الامامی، احمد بن یعقوب معروف بہ یعقوبی، جن کی تاریخ الیعقوبی یورپ اور نجف میں شائع ہو چکی ہے۔ محمد بن زکریا، ابو عبداللہ الحاکم معروف بہ ابن الفیع، مروج الذهب کے مصنف المسعودی اور الآداب السلطانیہ [2] کے مؤلف محمد بن علی بن طباطبا اور ان جیسے سینکڑوں افاضل ہیں جن کے شمار کا موقع نہیں۔

---

[1] متوفی ۱۴۰ھ [2] الذریعة ۱۶: ۱۲۵

Marfat.com

پھر مشہور شعرائے اسلام کا جائزہ لیجیے تو ان میں بھی شیعوں ہی کو اکثریت حاصل ہے۔ ارباب سخن کے مختلف طبقے ہیں:

پہلا طبقہ: اس میں زیادہ تر اصحاب ہیں اور اس سلسلے کے جتنے مشہور سخن سنج ہیں وہ سب کے سب تشیع سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر النابغة الجعدی جو صاحب ذوالفقارؑ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور اس معرکہ میں جو رجز کہے ہیں وہ بہت شہرت رکھتے ہیں۔[1] عروة بن زید الخیل، انہوں نے بھی حضرتؑ کے ساتھ صفین میں شرکت کی تھی۔[2] لبیدبن ربیعہ عامری شعراء کی ایک بڑی جماعت نے ان کی شیعیت کو ثابت کیا ہے۔ ابوطفیل عامر بن واثلة المشھور، ابو الاسود دؤلی اور بانت سعاد کے مصنف کعب بن زھیر و امثالھم۔

دوسرا طبقہ: تابعین کا معاصر ہے۔ اس جماعت میں فرزدق، الکمیت، کیثر عزة، السید الحمیری اور قیس بن ذریح و غیرھم کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔

تیسرا طبقہ: دوسری صدی ہجری سے متعلق ہے۔ اس میں دعبل خزاعی، ابی نؤاس، ابی تمام، البحتری، دیك الجن عبد السلام، ابی الشیص، الحسین بن الضحاك، ابن الرومی، منصور النمری، الأشجع الأسلمی، محمدبن وھب اور صریع الغوانی کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ محتاج بیان نہیں نیز مروان بن ابی حفصة اور اس کی اولاد کو چھوڑ کر عباسی دور کے تمام بڑے ادیب اور شاعر شیعہ ہی تھے۔

چوتھا طبقہ: اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر مثلاً مغرب کے متنبی، ابن ھانی الاندلسی، ابن التعاویذی، الحسین بن الحجاج صاحب المجون، المھیار الدیلمی اور امیر الشعراء ابوفراس الھمدانی جن کی بابت یہاں تک کہا گیا ہے: شعر کی ابتدا بادشاہ سے ہوئی اور خاتمہ بھی بادشاہ پر ہوا نیز کشاجم، الناشئ الصغیر، الناشئ الکبیر، ابوبکر الخوارزمی، البدیع

---

[1] نصر بن مزاحم نے واقعہ صفین کے بارے میں صفحہ ۲۵۵ پر رجزیہ اشعار روایت کیے ہیں۔ [2] الاغانی ۱۷: ۲۵۸

Marfat.com

الهمدانی، الطغرائی، جعفر شمس الخلافة، السری الوفاء عمارة الیمنی، الوداعی، الخبزأرزی، الزاھی، ابن بسام البغدادی، السبط ابن التعاویذی السلامی اور النامی بلکہ یتیمة الدھر الثعالبی (جو چار جلدوں پر مشتمل ہے) کے بیشتر اساتذۂ فن شیعہ ہیں۔

حقیقت یہ کہ اصناف شعر و ادب میں شیعوں نے اتنا عروج حاصل کیا کہ سخن شناسوں کو یہ کہنا پڑا: کیا شیعوں کے علاوہ بھی کوئی ادیب ہوتا ہے!؟ نیز تحسین کلام کے سلسلے میں یہ کہاوت تو عربوں میں عام ہوگئی تھی: فلاں سخنور تو اپنے شعر سے بالکل شیعہ لگتا ہے۔

کچھ لوگوں نے متنبی اور ابو العلاء کو بھی شیعہ لکھا ہے نیز سند کے طور پر ان کے بعض اشعار کا بھی حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آپ المراجعات الریحانیة [1] کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیں تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔

ہاں ان طبقوں میں خاندان قریش کے شیعہ شعراء الفضل بن العباس ابن عتبة بن ابی لھب، جیسے ابی دھیل الجمحی، وھب بن ربیعة وغیرہ جن کے حالات الاغانی میں درج ہیں۔ علاوہ ازیں خاص علوی ادیب مثلاً الشریفین الرضی و المرتضی، الشریف أبی الحسن علی الحمانی فرزند شاعر الشریف محمد بن جعفر بن محمد الشریف بن زید بن علی بن الحسین علیہم السلام سب کے سب شعراء شیعہ تھے۔ شریف حمانی فرماتے تھے: میں شاعر، میرے باپ شاعر، میرے دادا شاعر۔

محمد بن صالح العلوی نہایت بلند مرتبہ ادیب تھے۔ ابو الفرج اصفھانی نے ممدوح کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے گراں مایہ نتائج فکر کا بھی تعارف کروایا ہے۔[2] اسی طرح الشریف بن الشجری وغیرہ۔ یہ سب علوی سلسلہ کے ممتاز ہنرمند شعراء ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے نسمة السحر ممن تشیع و شعر [3] کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اشریع الیمانی کے اس وقیع شاہکار میں نہ صرف علوی ادیبوں ہی کا خاطر خواہ تذکرہ ہے، بلکہ اموی گھرانے کے شیعہ شعراء کے حالات بھی موجود ہیں۔ مثلاً

---

[1] الذریعة ۴:۲۹۵ و ۸:۲۹۳۔ معجم المولفین ۳:۱۰
[2] الاغانی ۱۲:۳۶۰۔۳۷۲
[3] الذریعہ ۲۴:۱۵۴

Marfat.com

مروان بن الحکم کا بھائی عبد الرحمٰن بن الحکم،[1] خالد بن سعید بن العاص، مروان بن محمد السروجی اموی شیعی جن کا ذکر کرتے ہوئے زمخشری نے اپنی کتاب ربیع الأبرار میں غالباً یہ ابیات بھی درج کیے ہیں:

یابنی هاشم بن عبد مناف　　أتی منکم بکل مکان
انتم صفوة ال له و منکم　　جعفر ذوالجناح و الطیران
و علیّ و حمزة اسد اللّٰه　　و بنت النبیؐ والحسنان
و لئن کنت من امیة انی　　البرئ منهم الی الرحمٰن[2]

اے آل ہاشم ابن عبد مناف میں جہاں بھی ہوں تمہارا ہوں۔ تم خاصان خدا ہو اور جعفر طیارؓ تمہارے ہی کنبہ کے بلند پرواز فرد ہیں۔ علیؑ شیر کردگار، حمزہؓ، دختر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حسنین علیہما السلام تمہارے ہی خاندان کی شخصیات ہیں۔ ہاں! میں اگرچہ کہ اموی نژاد ہوں لیکن حاشا وکلا کہ مجھے بنو امیہ سے کوئی واسطہ نہیں!

اسی طرح ابو الفرج اصفہانی صاحبِ الآغانی و مقاتل الطالبین اور نجدیات و عراقیات کا شہرت یافتہ مصنف الابیوردی الاموی وغیرہم (جن کے نام لکھنا ضروری نہیں) بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس سلسلے کے اور بھی بہت سے مشاہیر ہیں، مگر چونکہ کتاب قلم برداشتہ لکھی جا رہی ہے، بنا بر ایں سب کے حال احوال کی تشریح مشکل ہے۔

نیز جب بڑے بڑے فرمانرواؤں، عظیم سیاستدانوں اور مدبر وزراء کی تاریخ سامنے آتی ہے تو یہاں بھی شیعہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ الفاطمية اور البويهية حکمرانوں کے علاوہ آل ہمدان، بنی مزید ابن صدقة، بنی د بیس، عمران ابن شاهين امير البطائح، المقلد ابن المسيب العقيلي اور قرواش بن المسيب ایسے سلاطین شیعہ ہی تھے نیز وجيه الدولة ذوالقرنين تغلبي أبي مطاع اور مغرب و افریقہ کے فرمانروا تميم بن المعزبن باديس کی شیعیت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات

---

[1] الاغانی ۱۳: ۲۶۳　[2] ربیع الابرار ۱: ۴۹۲۔ معجم الشعراء: ۳۲۱

Marfat.com

نہیں۔ اس فہرست میں بھی مزید بہت سے نام آ سکتے ہیں۔

وزراء کی صف میں تو سب شیعہ ہی شیعہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسحاق کاتب، غالباً یہ پہلے شخص ہیں جن کے لیے رسمی طور پر وزیر کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابی سلمۃ الخلال حفص بن سلیمان الھمدانی الکوفی ، یہ پہلے عباسی خلیفہ کے پہلے وزیر تھے۔ السفاح نے ان کی انتظامی قابلیت کے پیش نظر سلطنت کے جملہ امور ان کے حوالے کر دیے تھے۔ ابی سلمۃ نے وزیر آل محمد کے لقب سے شہرت پائی، لیکن پھر آل محمدؐ کی دوستی کے باعث السفاح کے سفاک ہاتھوں شہید ہوئے۔

ابی عبداللہ یعقوب بن داؤد ، مہدی عباسی کے وزیر تھے۔ خلیفہ نے پورا نظم ونسق ان کو سونپ دیا تھا۔ یہ شعر انہیں کے متعلق ہے۔

بَنِــی اُمَیَّة هُبُّــوا طَــالَ نَوْمَـكُمُ
اِنَّ الْــخَــلِيــفَةَ يَــعْــقُوْبُ ابْـنُ داؤدِ
بنی امیہ! اٹھو، خواب گراں سے بیدار ہو۔
دیکھو اب خلیفہ یعقوب بن داوٗد ہے۔ [1]

آخر میں انہیں بھی زندان کی صورت دیکھنا پڑی۔

آل نوبخت اور بنو سہل تو وزارت ہی کے گھرانے کہلاتے ہیں۔ فضل بن سہل، حسن بن سہل، مامون رشید کے وزراء تھے۔

اسی طرح بنو الفرات میں سے الحسن بن علی دور مقتدر میں تین مرتبہ وزارت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ابوالفتح الفضل بن جعفر بھی اسی گھرانے سے ہیں۔ بنو العمید میں سے محمد بن الحسین ابن العمید اور ان کے بڑے بیٹے ذو الکفایتین ابوالفتح علی بن محمد، رکن الدولہ کے وزیر تھے۔

طاھر خزاعی کی اولاد کو بھی مامون اور دیگر عباسی خلفاء نے اپنا وزیر بنایا۔ مھلبی حسن بن ھارون ، ابو دلف العجلی، صاحب بن عباد اور عظیم سیاستدان ابوالقاسم وزیر مغربی، ابو عبد اللہ حسین بن زکریا جو شیعی کے لقب سے شہرت رکھتے تھے اور سلطنت فاطمیہ کے بانی اور صاحب حکومت و سیاست

---

[1] امالی السید مرتضیٰ ۱: ۱۳۱ ۔ الاغانی ۳: ۳۴۲ ۔ سیر اعلام النبلاء ۸: ۳۴۷ ۔ دیوان شاعر ۳: ۹۴

Marfat.com

مانے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ابراھیم ابن العباس الصولی متوکل کی حکومت کے مشہور کاتب، دولت فاطمیہ کے مشہور وزیر طلائع بن زریك، مصر کے سپہ سالار افضل اور ان کے فرزند ابو الحسن جعفر بن محمد بن فطیر، ابو المعالی ھبتہ اللّٰہ ابن محمد بن مطلب وزیر مستظھر اور موید الدین محمد بن عبد الکریم قمی آل مقداد پہلے ناصر کے پھر ظاھر کے وزیر ہوئے۔ اس کے بعد مستنصر نے وزارت پیش کی۔

حسن بن سلیمان برامکہ کے عہد میں چیف سیکرٹری تھے۔ یہ بھی شیعی لقب سے مشہور ہوئے۔ جیسا کہ صولی نے اپنی کتاب الاوراق میں لکھا ہے۔

یحیٰ بن سلامۃ الحصفکی، صاحب فہرست ابن ندیم، ابو جعفر احمد بن یوسف اور ان کے بھائی ابو محمد القاسم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں کہے ہوئے دونوں بھائیوں کے قصائد و مراثی آپ اپنی نظیر ہیں[1] مامون کے زمانے میں معتمد عمومی تھے بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی یہ عہدہ ان کے پاس رہا۔ اسی طرح ابراھیم بن یوسف اور ان کے فرزند۔

نیز عربی زبان کے ناخدا اور معجم کے مصنف ابو عبد اللہ محمد بن عمران المرزبانی کا نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ سمعانی نے ان کے تشیع[2] کا ذکر کیا ہے و علیٰ ھذا القیاس، سینکڑوں ہستیاں ہیں جن کی انتظامی قابلیت، سیاسی بصیرت اور قومی خدمات کا ریکارڈ پیش کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

ہمارے والد علام نے شیعوں کے مختلف طبقوں کے حالات جمع کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ چنانچہ دس جلدوں میں علماء، حکماء، سلاطین، وزراء، ہیئت داں اور اطباء وغیرہ جیسے تیس طبقوں پر حروف تہجی کے مطابق روشنی ڈالی۔ اس مجموعہ کا نام ہے الحصون المنیعۃ فی طبقات الشیعۃ۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ ضخیم تالیف بھی جامع نہیں۔

اس منزل پر پھر ہم صاحب فجر الاسلام سے دریافت کریں گے کہ آپ کے خیال میں جنہوں نے معارف اسلامیہ کو پروان چڑھایا اور علم و دانش کو استحکام بخشا، کیا وہ دین متین کو منہدم کرنے کے درپے تھے؟ اور آپ اور جناب کے استاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین مذہب اسلام کے حامی ہیں؟ اگر یہی صورت حال ہے تو اس زندگی پر صد حیف

Marfat.com

اور ایسے اسلام کو سلام! بلکہ بقول شاعر جب حاتم کو بھی بخیل کہا جانے لگے تو بہتر ہو گا کہ

موت آ جائے کہ قصہ پاک ہو!

حقیقت یہ ہے کہ مدعائے تحریر یہ نہ تھا، لیکن خامہ چل پڑا اور بہت سی باتیں بیچ میں آ گئیں۔ شاید حال و استقبال کے اہل قلم اس سے کچھ متاثر ہوں اور کم از کم ان میں تحریر کا سلیقہ اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے اظہار کی صلاحیت آ جائے۔

حکیم اسلام حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

لِسَانُ الْعَاقِلِ مِنْ وَرَاءِ قَلْبِہٖ وَ قَلْبُ الْجَاھِلِ مِنْ وَرَاءِ لِسَانِہٖ۔ [۳]

دانشمند کی زبان اس کے دل کے تابع ہوتی ہے اور جاہل کا دل اس کی زبان کا فرمانبردار ہوتا ہے۔

احمد امین کا یہ قول:

رجعت کے عقیدہ سے تشیع میں یہودیت نے ظہور کیا۔

انتہائی اندوہناک ہے۔ کاش! وہ بتا سکتے کہ رجعت شیعوں کا کوئی اساسی مسئلہ ہے یا ان کے مذہب کا کوئی بنیادی رکن، جسے نکتہ چینی کا موضوع بنایا گیا ہے؟

کسی فرقے کے بارے میں جس کسی کی بھی معلومات کا یہ عالم ہو تو کیا اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سکوت اختیار کر کے اپنا بھرم قائم رکھے۔

واقعہ یہ ہے کہ عقیدہ رجعت لازمہ تشیع نہیں، البتہ اس کا اقرار ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمام اسلامی حلقوں میں اخبار غیب، علامات قیامت، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد اور خروج دجال وغیرہ کا اعتبار ہے۔ لیکن نہ یہ باتیں عین اسلام ہیں، نہ ان کا انکار اسلام سے خارج ہونے کا سبب ہے اور نہ ہی ان کا مجرد اعتراف کسی کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ یہی کیفیت عقیدہ رجعت کی ہے نیز اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ اس کا تعلق شیعوں کے اصول سے ہے تو کیا کسی یہودی مسئلہ

---

[۱] ملاحظہ ہو صولی کی الاوراق
[۲] الانصاب للسمعانی: ۵۲۱
[۳] شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید ۷: ۹۰

Marfat.com

سے اتفاق کو یہودیت سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ مسلمان توحید کے قائل ہیں۔ یہودی بھی ایک ہی معبود کی پرستش کرتے ہیں تو کیا اس اشتراک خیال سے اسلام کو یہودیت سے وابستہ کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں؟

اس عقیدے کے سلسلے میں مطعون کرنے والوں کو نہ معلوم کیا غیر معمولی شے نظر آتی ہے جو اس درجہ جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

خداوند عالم ایک گروہ کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔

یہ کون سا محال کام ہے؟ کیا کسی نے کلام الٰہی میں یہ قصہ کبھی نہیں پڑھا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ [1]

کیا آپ نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے تھے؟ اللہ نے ان سے فرمایا: مرجاؤ، پھر انہیں زندہ کر دیا۔

اور یہ آیۂ کریمہ بھی کسی کی نظر سے نہیں گزری؟

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا [2]

اور جس روز ہم ہر امت میں سے ایک ایک جماعت کو جمع کریں گے۔

اگر اس سے مراد قیامت لی جائے تو قیامت کے روز تو ہر قوم سے ایک گروہ نہیں بلکہ تمام امتیں محشور ہوں گی!

یہ آج کی بات نہیں، علمائے جمہور صدر اول ہی سے اس مسئلہ کو ہدف ملامت قرار دیتے چلے آئے ہیں، بلکہ اس ضمن میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کسی جلیل القدر شیعہ راوی یا محدث کے اعتبار و اعتماد کو مجروح کرنے کا کوئی موقع نہیں پاتے تو کچھ اس انداز سے رجعت کا طعنہ دینے لگتے ہیں جیسے کسی پر بت پرستی یا شرک کا الزام لگایا جا رہا ہو۔ زیر بحث معاملہ میں مومن طاق اور ابو حنیفہ کا واقعہ خاصی شہرت رکھتا ہے۔

بہرحال میرے نقطہ نظر سے یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے ثابت کرنے

---

[1] البقرۃ: ۲۴۳ [2] النمل: ۸۳

Marfat.com

کی جد و جہد کی جائے۔ چنانچہ غلط اندیش لوگوں کی صرف ذہنی بے راہروی ہی منکشف کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

فجرالاسلام کے مصنف فرماتے ہیں:

مجموعی طور پر آگ شیعوں پر حرام ہے۔

خدا معلوم یہ نظریہ شیعوں کی کس کتاب سے ڈھونڈ نکالا۔ کاش فاضل قلم کار کو نقد و نظر ہی کا کچھ خوف ہوتا اور اپنے ادعا کے لیے کوئی ثبوت ضروری سمجھتے۔

شیعوں کی کتب، ان کے مؤلفات علی الاعلان کہ رہے ہیں: جنت، اللہ کے فرمانبردار بندے کا انعام ہے، خواہ وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو اور دوزخ سرکش عنصر کا حصہ ہے، چاہے اس میں قریشی سید ہی کیوں نہ شامل ہو۔

اس مضمون کی روایات ان کے ائمہ سے مروی ہیں اور اس حد تک کہ شمار مشکل!

البتہ مسئلہ شفاعت ایک علیحدہ چیز ہے، جس کے تمام مسلمان قائل ہیں اور جو دین اسلام کی ضروریات میں شامل ہے۔[1]

مگر ہم پھر کہیں گے کہ اگر اسے شیعوں کا عقیدہ تصور کر بھی لیا جائے تب بھی یہودیت کا ظہور کیسے ہوا؟

جناب ابو حنیفہ نکاح کے بعض مسائل میں مجوسیوں سے اتفاق کرتے ہیں۔[2]

لیکن یہ کہنا کسے زیب دے گا کہ امام احناف نے اپنی فقہ کی بنیاد مجوسیت پر قائم فرمائی ہے اور مزید ثبوت کے لیے آپ کے عجم نژاد ہونے سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

الغرض یہ سب جذباتی طور طریقے ہیں۔ جن سے بس آپس میں انتشار و افراق پیدا کرنے کی حسرتیں پوری کی جاتی ہیں۔

---

[1] صحیح البخاری ۱: ۹۰ کتاب التیمم، ۸: ۸۲ کتاب الدعوات۔ صحیح المسلم ۱: ۱۸۸ کتاب الایمان و۴: ۱۷۸۲ باب تفضیل نبینا علی جمیع الخلائق۔ سنن ابن ماجه ۲: ۱۴۴۰ کتاب الزهد، باب ذکرالشفاعة۔ موطا مالک ۱: ۲۱۲ کتاب القرآن، باب ما جاء فی الدیان۔ مسند احمد ۲: ۲۷۵، ۳۱۳، ۳۹۲، ۴۰۹، ۴۲۶، ۴۳۰، ۴۸۶ و۳: ۲، ۱۴۴، ۲۰۸، ۲۱۸، ۲۵۸، ۲۷۶، ۲۹۴، ۳۸۴، ۳۹۶ و۵: ۱۴۸۔

[2] المبادی العامة للفقه الجعفری: ۳۱۷ ....

Marfat.com

شیعہ مذہب میں مسیحیت کے اثر کا طعنہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ احمد امین کوئی حوالہ سپرد قلم کرتے۔

لیکن غالباً انہوں نے خطابیہ، غرابیہ، علیاویہ، مخمسہ، بزیعیہ جیسے غالی فرقوں کو بھی شیعہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ قرامطہ کی طرح ان ملحد گروہوں کو فرقہ شیعہ سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ امامیہ شیعہ اور ان کے دینی پیشوا ان تمام مکاتب سے بے تعلق ہیں۔ کیونکہ مذکورہ جماعتیں عیسائیوں کی طرح نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ امام خود ذات باری ہے، خواہ ظہور کی شکل میں ہو یا اتحاد و حلول کی صورت میں وغیرہ وغیرہ۔ ان کے یہ غلط افکار متصوفین کے عقائد و مسلمات سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ مشہور مشائخ طریقت جیسے حلاج، گیلانی، رفاعی اور بدوی وغیرہم کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو اس منزل پر فائز سمجھتے ہیں جو ان کی دانست میں ربوبیت سے بلند تر اور مقام الوہیت سے زیادہ اونچی تھی۔ وحدت الوجود یا موجود کے قائل بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے تصورات کے حامل ہیں۔

مگر امامیہ شیعہ جو کروڑوں کی تعداد میں عراق، ایران، شام، ذیلی براعظم ہند و پاکستان اور افغانستان میں آباد ہیں، وہ بحیثیت شیعہ ان تمام خرافات سے بری نیز ان جملہ خرافات کو کفر و ضلالت شمار کرتے ہیں۔ ان کا مذہب توحید خالص ہے۔ نہ وہ ذات اقدس الٰہی میں مخلوق کی کسی مشابہت کے قائل ہیں اور نہ اس کی صفات کاملہ میں کسی نقص و تغیر کے روادار، بلکہ وجوب وجود، قدم، ازلیت اور تنزیہ و تقدیس کے منافی ہر تصور کو باطل قرار دیتے ہیں۔

شیعوں کا کلامی ذخیرہ ان بلند نظریات سے مملو ہے۔ اس سلسلے میں مختصر سی مختصر کتاب مثلاً تجرید یا بڑی سے بڑی تصنیف مثلاً اسفار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے نیز ان کے علاوہ اور ہزاروں کتب موجود ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ان کے اکثر ابواب تناسخ، اتحاد، حلول اور تجسیم کی رد کرتے ہیں۔

بہرحال، صاحب فجر الاسلام نے شیعوں پر انتہائی غلط الزامات عائد کر کے مذہب و ملت کی کوئی صحیح خدمت انجام نہیں دی۔

چونکہ ہم اس کتاب کا تعاقب نہیں کرنا چاہتے، اس لیے مزید لغزشوں کو نظر انداز

Marfat.com

کرتے ہیں اور یہ چند باتیں بھی محض نمونے کے طور پر پیش کی گئیں ہیں تاکہ دنیا کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ جب سواد اعظم کے علماء اور اہل قلم کا یہ حال ہے تو بے سواد عوام کی کیا کیفیت ہو گی۔

مصیبت یہ ہے کہ شیعوں کے متعلق لکھنے والے عام طور پر ابن خلدون بربری جو افریقہ کے دوسرے کونے مغرب بعید میں بیٹھ کر مشرق بعید عراق کے شیعوں کے بارے میں لکھتا ہے اور احمد بن عبد ربہ اندلسی جیسے دور افتادہ علاقوں کے خامہ فرساؤں کو مأخذ قرار دیتے ہیں یا پھر عصر حاضر کے قلم کار روشن خیالی کے زعم میں ولہوزن اور ڈوزی وغیرہ کو حجت سمجھتے ہیں، مگر کوئی بندۂ خدا شیعوں کے علمی ذخائر کی جانب توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتا جو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

نتیجہ یہ کہ جب کوئی شیعہ ان افاضل کی تصانیف کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے بارے میں کچھ اسی قسم کی تک بندیاں دکھائی دیتی ہیں جن کا تذکرہ راغب اصفہانی نے کسی موقع پر اپنی کتاب المحاضرات میں کیا ہے۔ موصوف ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ جعفر بن سلیمان کے دربار میں ایک مسلمان کسی دوسرے کے کفر کا گواہ تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ مدعی کے متعلق کیا جانتے ہو تو اس نے بیان دیا:

> یہ شخص خارجی ہے، معتزلی ہے، ناصبی ہے، حروری ہے، جبری ہے، رافضی ہے، علی بن خطاب، عمر بن ابی قحافہ، عثمان بن ابی طالب اور ابوبکر بن عفان کو برا بھلا کہتا ہے، حجاج کو گالیاں دیتا ہے جس نے کوفہ کو ابوسفیان پر گرایا اور قطائف کے دن (یوم طف، روز عاشورا) حسین ابن معاویہ سے جنگ کی۔

یہ سن کر جعفر نے کہا:

> تجھے خدا سمجھے! نہ جانے میں تیری کس چیز پر حسد کروں۔ تاریخ دانی پر، مذہب شناسی پر یا جغرافیائی معلومات پر![1]

رہ گیا عبداللہ بن سبا، جسے شیعوں کے ساتھ چپکایا جاتا ہے یا شیعہ فرقہ کو اس سے چسپاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اس ضمن میں شیعوں کی کسی بھی کتاب کا مطالعہ

---

[1] محاضرات الادباء ۴: ۴۱۸۔

Marfat.com

کر لیا جائے، تمام مؤلفات میں اس شخص سے بیزاری کا اعلان ملے گا بلکہ رجال شیعہ میں اس کے متعلق جو ملائم سے ملائم جملہ نظر آئے گا وہ یہ کہ عبد اللّٰہ بن سبا العن من ان یذکر۔[2]

اس سلسلے میں بعض حضرات کی یہ رائے بھی بعید نہیں ہے کہ عبد اللہ بن سبا، مجنون عامری، ابو ہلال اور اس جیسے کردار، داستان سراؤں کے افسانوی ہیرو ہیں۔ اموی اور عباسی سلطنتوں کے وسطی دور میں عیش وعشرت اور لہو ولعب کو اتنا فروغ حاصل ہو گیا تھا کہ داستان گوئی اور افسانہ سرائی محل نشینوں اور آرام طلبوں کا جزو زندگی بن گئی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی کہانیاں بھی ڈھل گئیں۔

ہمارا مقصد، تجزیہ احوال نہیں لیکن عصر حاضر کے مصنفین کے پے در پے حملوں کو دیکھ کر یہ ضروری سمجھا کہ مختصر طور پر شیعوں کے عقائد و مسلمات اور ان کے اہم اصول و فروع اور اجماعی مسائل کا تعارف کروایا جائے۔ خیال رہے کہ شیعہ مذہب میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور جہاں تک اجماع، کتاب، سنت اور ضروریات عقل کی مخالفت نہیں ہوتی، ہر مجتہد اپنی رائے میں آزاد ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر استنباط کرنے والے کو گمراہ تصور کیا جائے گا اور ایسے شخص کی رائے قطعی طور پر ذاتی، انفرادی اور ناقابل عمل سمجھی جائے گی۔

ان اوراق میں تمام مسائل کی تفصیل کا موقع نہیں! چنانچہ یہاں صرف وہ کلیات پیش کیے جائیں گے جو شیعیت کا محور ہیں اور جن میں اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں۔ دلائل و براہین کی جانب بھی زیادہ توجہ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ یہ بڑی کتب ہی کے لیے مناسب ہے نیز ہماری غرض و غایت صرف یہ ہے کہ تمام مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر شیعوں کے حقیقی معتقدات سے آگاہ ہو جائیں اور وہ اپنے بھائیوں کی جانب غلط عقائد کی نسبت دے کر خود پر ظلم نہ کریں اور نہ انہیں بھوت، پریت، دیو، جن، وحشی اور آدم خور سمجھ کر اپنے معاشرہ سے الگ سمجھیں۔ کیونکہ خدا کے فضل کرم سے شیعیان حیدر کرار اسلامی آداب سے آراستہ، قرآنی تعلیمات سے پیراستہ، نعمت ایمان

---

[2] رجال ابو علی: ۲۰۳۔ رجال الکشی ۱: ۳۲۳۔ رجال الطوسی: ۵۱۔ ۷۶۔ نقد الرجال: ۹۹، ۱۳۱۔ الخلاصه (القسم الثانی): ۱۹: ۲۳۷۔ تنقیح المقال ۲: ۱۸۳

Marfat.com

سرافراز اور مکارم اخلاق سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب وسنت پر ایمان اور اصول عقل پر ایقان رکھتے ہیں۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم جذبات سے کھیلنے والوں کو سوچنے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور وحدت اسلامی کو استحکام حاصل ہو۔

محمد الحسین آل کاشف الغطاء

نجف اشرف۔ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

Marfat.com

شیعیت کی
ابتداء اور ارتقاء

تاریخ آغاز

تشیع کوئی نیا مذہب نہیں۔ جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے وہیں سے شیعیت کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ چمن آرا شریعت یعنی سرکار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے ساتھ ہی ساتھ اپنے ہی ہاتھوں یہ پودا لگایا، آبیاری کی اور خود حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی اس کی نگہداشت فرماتے رہے۔ پودا بڑھ کر ہرا بھرا درخت ہوا اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں پھولنے بھی لگا۔ مگر پھلنے نہ پایا تھا کہ چراغ نبوت گل ہو گیا۔

حدیث دیگراں: اس دعوے میں ہم منفرد نہیں بلکہ سواد اعظم کے بڑے بڑے علماء بھی ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی اپنی مشہور تفسیر درمنثور میں بضمن قول باری تعالیٰ: أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ[1] وہ یقیناً بہترین خلائق میں سے ہیں تحریر فرماتے ہیں:

> ابن عساکر جابر بن عبداللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں: ہم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ سامنے سے علی علیہ السلام نمودار ہوئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا: قسم ہے اس پاک پروردگار کی جس کے قبضہ قدرت

---

[1] البینۃ: ۷

Marfat.com

میں میری جان ہے کہ قیامت میں یہ اور ان کے شیعہ ہی کامیاب
رہیں گے۔[1]

ابن عدی ابن عباس سے ناقل ہیں کہ جب آیہ وافی ہدایہ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ[2] نازل ہوئی تو حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالب علیہ السلام سے ارشاد فرمایا:

اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں، جو قیامت میں خوش و خرم
ہوں گے۔

ابن مردویہ نے خود حضرت علی علیہ السلام کی زبانی اس حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرتؑ کا بیان ہے کہ سرور عالمؐ نے مجھ سے فرمایا:

اے علی علیہ السلام! کیا تم نے خداوند عالم کا یہ ارشاد نہیں سنا:
اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ الۡبَرِیَّۃِ ؕ[3]
بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے رہے، یہی لوگ
بہترین خلایق ہیں۔
اس سے تم اور تمھارے شیعہ ہی مراد ہیں۔ میرا اور تم لوگوں کا
وعدہ حوض کوثر پر پورا ہوگا اور اس وقت جب کہ تمام امتیں حساب
پیش کرنے کے لیے حاضر ہوں گی تم لوگ تابندہ جبین، روشن قدم
کہکر بلائے جاؤ گے۔
یہ سیوطی کی ترقیم کردہ روایات تھیں۔[4]

ابن حجر مکی نے بھی ان میں سے بعض احادیث کو دار قطنی کے حوالے سے صواعق المحرقة میں درج کیا ہے اور جناب ام سلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اے علی علیہ السلام! تمھیں اور تمہارے شیعوں کو جنت نصیب ہوگی۔[5]

---

[1] یہ حدیث صواعق المحرقة کے صفحہ ۹۳ اور ابن صباغ مالکی کی الفصهول المهمة کے صفحہ ۱۲۲ پر بھی مرقوم ہے۔
[2] البینة: ۷ [3] البینة: ۷ [4] الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور ۶: ۳۷۹
[5] الصواعق المحرقة: ۹۶

Marfat.com

ابن اثیر نے بسلسلہ لفظ قمح لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:

> بارگاہ ایزدی میں جب حاضری ہوگی تو تمہارے ساتھ تمہارے شیعہ بھی شاد کام آئیں گے اور دشمنوں کا یہ حشر ہوگا کہ غضب میں مبتلا اور ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے ہوں گے اور اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لے جا کر بتایا کہ دیکھو! یوں بندھے ہوں گے۔[1]

غالباً یہ حدیث ابن حجر نے صواعق میں درج کی ہے[2] اور دوسرے علماء نے بھی اسے مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جو اس کی شہرت کا ثبوت ہے۔ زمخشری کی ربیع الابرار میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نظر آتا ہے:

> اے علی علیہ السلام قیامت کے دن دامن رحمت باری میرے ہاتھ میں ہوگا اور میرا دامن تمہارے ہاتھ میں، تمہارا دامن تمہاری اولاد تھامے گی اور تمہاری اولاد کے شیعہ ان کے دامن سے متمسک ہوں گے۔ اس کے بعد دیکھنا ہمارے لیے کیا حکم ہوتا ہے۔[3]

مزید اطمینان کے لیے مسند احمد بن حنبل اور خصائص نسائی وغیرہ کا مطالعہ سودمند ہوگا، جن میں ایسی احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

قابل غور: مذکورہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا شیعیان علی علیہ اسلام کا ذکر کرتے رہے اور ان کی اس خصوصیت کی جانب بھی اشارے فرماتے رہے کہ یہ قیامت کے دن محفوظ رہیں گے، کامیاب ہوں گے اور خوش نظر آئیں گے۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیکر

---

[1] النہایۃ ۴: ۱۰۶

[2] کتاب الفضائل الخمسۃ من الصحاح الستۃ للسید مرتضی الحسینی وکتاب احقاق الحق و ازھاق الباطل للسید التستری۔

[3] ربیع الابرار ۱: ۸۰۸

Marfat.com

صداقت اور آیہ:

وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ۝ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۝[1]

وہ خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو (اس پر) نازل کی جاتی ہے۔

کا مصداق سمجھتا ہے، کم از کم اس نے تو ان اقوال کو ضرور سرمایہ ایمان تصور کیا ہو گا اور اگر کسی وجہ سے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری محفل علی علیہ السلام کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوئی ہوگی تو کچھ اصحاب کرام تو یقیناً ان اوصاف سے متصف ہونے کے لیے علی علیہ السلام کا دم بھرنے لگے ہوں گے۔ تاریخی واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو اس مفروضے کی خاصی تائید ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبویؐ ہی میں بزرگ اصحاب کا ایک گروہ جناب امیر علیہ السلام کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حضرت علیہ السلام کو اپنا روحانی پیشوا، تعلیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی مبلغ نیز احکام و اسرار نبوت کا واقعی شارح ومفسر بھی تسلیم کرتا ہے اور شیعہ کے نام سے شہرت پاتا ہے۔

ارباب لغت بھی اس حقیقت کے حامی ہیں۔ مشہور فرہنگ نہایۃ[2] اور لسان العرب[3] وغیرہ[4] اٹھا کر دیکھیے شیعہ کے معنی ہی یہ ملیں گے کہ یہ اس فرقہ کا اسم خاص ہے جو علی علیہ السلام اور اولاد علیؑ کا چاہنے اور ان کی پیروی کرنے والا ہو۔

اب اگر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ شیعہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو علی علیہ السلام سے محبت کرے یا آپؑ کا دشمن نہ ہو تو پھر اس لفظ کا استعمال ہی بے موقع ہو جائے گا۔ کیونکہ صرف چاہنے یا عداوت نہ رکھنے سے ایک شخص دوسرے شخص کا شیعہ نہیں کہلا سکتا، جب تک اس میں التزام کے ساتھ اقتداء اور اتباع کی خصوصیت نہ پائی جائے اور یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جسے عربی ادب کا معمولی سا ذوق رکھنے والے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

غالباً ان حقائق کے پیش نظر ہر معقول انسان مذکورہ احادیث پر توجہ دینے کے

---

[1] النجم: ۳۔۴ [2] النہایہ ۲: ۵۱۹۔ [3] لسان العرب ۸: ۱۸۹۔

[4] القاموس المحیط ۳: ۴۷۔ اقرب الموارد ۱: ۶۲۷۔ مجمع البحرین ۴: ۳۵۶۔ تاج العروس ۵: ۴۰۵۔

Marfat.com

بعد یہی نتیجہ نکالے گا کہ لفظ شیعہ سے مقصود عام لوگ نہیں، بلکہ ایک خاص گروہ ہے جو حیدر کرار علیہ السلام سے خصوصی تعلق رکھتا ہے۔

معاون اشارے: اس تصریح کے بعد شاید ہی کوئی منصف مزاج یہ نتیجہ نکالنے کی جرأت کرے کہ مندرجہ بالا احادیث اور اس مفہوم کی دوسری روایات میں ایک ایسی جماعت کے وجود کے نمایاں دلائل نہیں ہیں جو مولائے متقیان سے خصوصی ارتباط کے سبب اس وقت کے تمام مسلمانوں سے، جو سب کے سب آپ سے اظہار محبت کیا کرتے تھے، ممتاز ہوگی۔

میں ذاتی طور پر اس اعتراف کے حق میں نہیں ہوں کہ وہ صحابہ جو یہ راہ نہیں اختیار کر سکے انہوں نے شعوری انداز میں ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلاف ورزی کی۔ ممکن ہے ان میں سے بہت سوں نے یہ فرامین نہ سنے ہوں یا جن لوگوں نے شرف سماعت حاصل کیا، وہ منشا رسالتؐ ہی نہ سمجھ سکے ہوں!

علاوہ ازیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ ارشادات جن کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیرالمومنین علیہ السلام اہل بیت اطہار علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے مدارج و مراتب کا اعلان فرمایا ہے، اگر ان کے سمجھنے میں ذرا وسعت نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان روایات میں صرف عمومی فضائل ہی نہیں بلکہ دبستان تشیع کے سربراہ کی شناخت، حیثیت، صلاحیت اور اس مکتب کے قیام و حقانیت کی جانب بھی واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

عَلِيٌّ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰى[1]

علی علیہ السلام کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔

لا يُحِبُّكَ اِلَّا مُؤمِن، وَلا يُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِق[2]

---

[1] صحیح البخاری ۵: ۲۴۔ سنن ابن ماجۃ ۱: ۴۲، ۱۱۵۔ صحیح المسلم ۴: ۲۴۰۴۔ سنن الترمذی ۵: ۶۳۸، ۳۷۲۴ و ۶۴۰، ۳۷۳۱۔ اسدالغابۃ ۵: ۸۔ الریاض النضرۃ ۳: ۱۱۷۔ تاریخ بغداد ۴: ۲۰۴، حلیۃ الاولیاء ۷: ۱۹۴۔ ترجمہ الامام علی علیہ السلام من تاریخ دمشق ۱: ۱۲۴۔

[2] صحیح المسلم ۱: ۸۶، ۱۳۱۔ صحیح الترمذی ۵: ۶۳۵، ۳۷۱۷۔ سنن ابن ماجہ ۱: ۴۲، ۱۱۴۔ تاریخ بغداد ۲: ۲۵۵۔ ۸: ۴۱۷ و ۱۴: ۴۲۶۔ حلیۃ الاولیاء ۴: ۱۸۵۔ الریاض النظرۃ ۳: ۱۸۹۔

Marfat.com

اے علی علیہ السلام تمہارا دوست مومن ہے اور دشمن منافق۔

حدیث طائر

اَللّٰھُمَّ ائتِنِی بِاَحَبِّ خَلقِکَ اِلَیکَ[1]

پروردگار اپنے محبوب ترین بندے کو بھیج دے۔

لأعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَداً رَجُلاً یُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُولَہٗ وَ یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَ رَسُولُہ[2]

کل یہ علم اس مرد کو دوں گا جو خود بھی اللہ اور رسول کا چاہنے والا ہو گا اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس کے چاہنے والے۔

اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ: کِتَابَ اللّٰہِ وَعِترَتِی أھلَ بَیتِی[3]

امت والو! میں تم میں دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت اہل بیت علیہم السلام۔

عَلِیٌّ مَعَ الحَقِّ وَ الحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ[4]

علی علیہ السلام حق کے ساتھ ہیں اور حق علی علیہ السلام کے ساتھ۔

یہ اقوال زیادہ تر صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ماخوذ ہیں اور ایسی ہی ہزاروں صحیح السند روایات موجود ہیں۔

اس مختصر سے رسالے میں اتنی گنجائش کہاں جو تفصیل کو جگہ دی جائے۔ شوق تحقیق رکھنے والے علامہ سید حامد حسین صاحب لکھنوی کی مشہور کتاب عبقات الانوار

---

[1] سنن الترمذی ۵: ۶۳۶، ۷۲۱۔ اسد الغابة ۴: ۳۰۔ مستدرک الحاکم ۳: ۱۳۰۔ الریاض النظرة ۳: ۱۱۴۔ حلیة الاولیاء ۶: ۳۳۹۔ ترجمة الامام علی علیه السلام من تاریخ دمشق ۲: ۱۰۵-۱۵۱۔ تذکرة الخواص: ۴۴

[2] صحیح البخاری ۴: ۶۵ و۷۳۔ سنن الترمذی ۵: ۶۳۸، ۳۷۲۴۔ سنن ابن ماجه ۱: ۴۵۔ ۱۲۱۔ مسند احمد ۴: ۵۲۔ سنن البیهقی ۹: ۱۳۱۔ التاریخ الکبیر للبخاری ۷: ۲۶۳۔ المنصنف لعبد الرزاق ۵: ۲۸۷۔ ۹۶۳۷۔

[3] سنن الترمذی ۵: ۶۶۲، ۳۷۸۶، ۶۶۳، ۳۷۸۸۔ مسند احمد ۳: ۱۷ و ۵: ۱۸۱۔ مستدرک الحاکم ۳: ۱۰۹، ۱۴۸۔ اسد الغابة ۲: ۱۲۔

[4] تاریخ بغداد ۱۴: ۳۲۱، مستدرک الحاکم ۳: ۱۲۴، ترجمة الامام علی علیه السلام من تاریخ دمشق ۳: ۱۱۷، ۱۱۵۹۔

Marfat.com

کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو دس جلدوں پر مشتمل ہے اور بلحاظ ضخامت و افادیت صحیح بخاری سے دو چند بڑی اور ہماری تحقیقی مساعی کا صرف ایک شاہکار ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد

لیکن جب نبوت کا چراغ گل ہوگیا تو صحابہ کے ایک فریق نے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ کسی طرح خلافت علی علیہ السلام کو نہ ملنے پائے۔ اس مخالفت کا سبب خواہ آپؑ کی صغرسنی ہو یا خاندان قریش کا جذبہ رشک کہ نبوت و امامت بنو ہاشم کے گھر میں جمع نہ ہونے پائیں یا کچھ اور اسباب ہوں، جن کے تذکرے کا یہ موقع نہیں! لیکن بالاتفاق فریقین جب مسلمانوں سے بیعت لی جا رہی تھی، اس وقت علی علیہ السلام نے ابوبکرؓ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا اور بقول فاضل بخاری[1] آپؑ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی،[2] جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے بڑے صحابی جیسے زبیرؓ، عمارؓ، مقدادؓ وغیرہ نے بھی بیعت سے انکار کر دیا۔[3]

یہ سچ ہے کہ تقریباً ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ علی علیہ السلام کو نہ ریاست کی ہوس ہے اور نہ سلطنت کی تمنا۔

ذوقار[4] میں ابن عباس سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ فرزند ابوطالبؑ کس جادہ پر گامزن تھا۔ امیر المومنین علیہ السلام کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ دین سلامت رہے، حق کا سکہ چلے اور باطل فنا ہوجائے۔

---

[1] صحیح البخاری باب غزوۂ خیبر

[2] صحیح البخاری ۵: ۱۷۷۔ صحیح المسلم کتاب الجہاد و السیر ۵: ۱۵۲۔ الامامۃ و السیاسۃ ۱: ۱۱، مروج الذھب ۲: ۳۰۲۔ تاریخ الطبری ۳: ۲۰۸۔ الکامل فی التاریخ ۲: ۳۲۷۔ الصواعق المحرقۃ: ۱۳۔

[3] ان میں ابوذر غفاری و سلمان فارسی و مقداد بن عمرو و عمار بن یاسر و فروۃ بن عمرو و خالد بن سعید بن العاص و ابی بن کعب و براء بن عازب و قیس بن سعد بن عبادہ و خزیمہ بن ثابت وغیرہم شامل ہیں۔ مروج الذھب ۲: ۳۰۱۔ العقد الفرید ۴: ۲۵۹۔ تاریخ الطبری ۳: ۲۰۸۔ الکامل فی التاریخ ۲: ۳۲۵، تاریخ الیعقوبی ۲: ۱۰۳۔ تاریخ ابی الفداء ۲: ۶۳۔

[4] شرح نہج البلاغۃ للشیخ محمد عبدہ ۱: ۷۶، ۳۲۔ ابن عباس فرماتے ہیں: میں ذی قار میں داخل ہوا تو حضرت علی (ع) جوتے کا تلا گانٹھ رہے تھے۔ فرمانے لگے اس تلے کی کیا قیمت ہوگی۔ میں نے عرض کیا۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ علی (ع) نے فرمایا: بخدا میرے نزدیک تمہاری یہ حکومت جوتے کے اس تلے سے بھی کمتر ہے، سوائے اس کے کہ باطل کو دفع کر کے حق قائم کرسکوں۔

Marfat.com

صاحب ذوالفقار انہی بلند احساسات کے زیر اثر محض احتجاج پر اکتفا کرتے ہیں اور مسند خلافت کو الٹنے کی کوئی تدبیر نہیں اختیار فرماتے بلکہ مصالح رشد و ہدایت کے پیش نگاہ بقائے اسلام اور نشر احکام کے سلسلہ میں ہمیشہ حکومت وقت کو اپنے زریں مشوروں سے نوازتے رہے اور اگر علی علیہ السلام یہ مسلک اختیار نہ فرماتے تو نہ صرف اسلامی وحدت کا شیرازہ بکھر جاتا بلکہ عوام پھر جاہلیت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے۔

شیعہ بھی اپنے امیر کی روش پر چلتے رہے۔ تقاضائے وقت یہی تھا کہ تفریق سے کام نہ لیا جائے۔ اسی بناء پر خلفائے ثلاثہ کے دور میں اس فرقہ نے بحیثیت فرقہ ابھرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ دوستان علی علیہ السلام ہر حکمران کے طریق کار اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا خاموش مطالعہ کرتے رہے، یہاں تک کہ قوم نے خود ہی علی علیہ السلام کو منتخب کر لیا۔ امیرالمومنین علیہ السلام تخت امارت پر متمکن ہوئے لیکن معاویہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور اس نے صفین میں اپنی فوجیں بھر دیں!

نشر و اشاعت

صحابہ کی ایک جماعت تو پہلے ہی سے نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھی۔ یہ شورش دیکھ کر بقیہ اصحاب نے بھی آپ علیہ السلام کی معیت اختیار کر لی۔ عمار ابن یاسرؓ، خزیمہ ذوالشہادتینؓ اور ابوایوب انصاریؓ جیسے اسی (۸۰) سرکردہ صحابی جو تقریباً سب کے سب بدری اور عقبی تھے، ابوتراب علیہ السلام کی جماعت میں شامل ہو گئے اور ان میں سے اکثر نے[1] اپنی جانیں آپؑ کے پرچم تلے امام علیہ السلام پر نثار کر دیں۔

بہر حال لڑائیاں ہوتی رہیں اور ساتھ ہی معاویہ کی ریشہ دوانیاں بھی بڑھتی گئیں۔ نتیجتاً علی علیہ السلام نے جام شہادت نوش فرمایا۔ حاکم دمشق نے اطمینان کی سانس لی، مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ معاویہ کے شاہی ایوانوں سے اسلام رخصت اور قیصر و کسریٰ کی روایات پروان چڑھنے لگیں۔ کہاں علی علیہ السلام کا وہ مقدس طریق حیات، زاہدانہ اطوار، اعلیٰ کردار اور کہاں معاویہ کے یہ بگڑے ہوئے رنگ ڈھنگ۔

---

[1] عمار بن یاسر، خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین، ابوعمرۃ الانصاری، ثابت بن عبید الانصاری، عبداللہ بن بدیل الخزاعی، ابوالہیثم مالک بن التیہان، ہاشم مرقال، عبدالرحمٰن بن بدیل الخزاعی، جندب بن زہیر ازدی، سعد بن حارث انصاری وغیرہم۔

Marfat.com

عمر عاص اور مصر کی تولیت[1]

یزید اور حادثہ استخلاف!

زیاد اور واقعہ استلحاق![2]

یہ ایسے غیر آئینی امور تھے جن سے معاویائی ذہنیت بری طرح آشکار ہو چکی تھی۔ پھر عیش و عشرت کے بڑھتے ہوئے طوفان نے تو گوشہ گوشہ نمایاں کر دیا۔ اللہ اللہ! کہاں اسلام کا بتایا ہوا سیدھا سادہ آئین زندگی اور کہاں فرزند ابوسفیان کا بازنطینی طمطراق!!

معاویہ کے شاہانہ ارمان مسلمانوں کی گاڑھی کمائی سے پورے ہو رہے تھے۔ اموی راج محل کا سب رس یعنی وہ پر تکلف دسترخوان جو آج بھی ضرب المثل ہے، شاہ جم کی لذت پرستی کا چنا ہوا ثبوت تھا۔

وزیر ابوسعید منصور بن حسین آبی[3] نے اپنی تالیف نثر الدرر میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں:

> احنف بن قیس کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں معاویہ کے پاس گیا تو انہوں نے میرے آگے انواع و اقسام کی اتنی غذائیں لگا دیں جن کا شمار مشکل تھا۔ میں دیکھ دیکھ کر حیران تھا کہ کھاتے کھاتے انہوں نے خاصے کی ایک چیز میری طرف بڑھائی جسے میں پہچان نہ سکا۔ دریافت کیا، یہ کیا ہے؟ جواب ملا یہ بھیجا بھری بطخ کی آنتیں ہیں۔ پہلے انہیں پستے کے تیل میں تل لیا گیا اور پھر اوپر سے مختلف مصالحے چھڑک دیے گئے۔ احنف کا بیان ہے کہ میں یہ سن کر رونے لگا۔ معاویہ نے پوچھا: روتے کیوں ہو؟ میں نے جواب

---

[1] واقعہ صفین: ۳۴، تاریخ الیعقوبی ۲: ۱۸۴، شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید المعتزلی ۲: ۶۱۔ سیر اعلام النبلاء ۳: ۷۲۔ مختصر تاریخ دمشق ۱۹: ۲۴۴، العقد الفرید ۴: ۹۷ و ۵: ۹۲، عیون الاخبار ۱: ۴۳۸۔

[2] تاریخ الطبری ۵: ۲۱۴۔ الکامل فی التاریخ ۳: ۴۴۱۔ مروج الذہب ۳: ۱۹۳۔ العقد الفرید ۵: ۲۶۷ و ۶: ۱۴۴۔ سیر اعلام النبلاء ۳: ۴۹۵۔ الصابۃ ۳: ۴۳۔

[3] متوفی ۴۲۲ھ

Marfat.com

دیا: اس وقت مجھے علی علیہ السلام یاد آ گئے۔ ایک دن کی بات ہے۔ خدمت اقدس میں حاضر تھا، افطار کا وقت آ گیا۔ حضرت علیہ اسلام نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں ایک سر بمہر تھیلی لائی گئی۔ میں نے سوال کیا حضور اس میں کیا ہے؟ ارشاد ہوا: جو کے ستو! عرض کی: امیر المومنین (ع)! چوری کا اندیشہ تھا یا شدت اقتصاد کے باعث تھیلی پر مہر لگائی ہے؟ فرمایا: ان میں سے کوئی وجہ نہیں۔ اس احتیاط کا سبب صرف یہ خیال تھا کہ کہیں میرے فرزند حسن وحسین علیہا السلام ان ستوؤں میں گھی یا روغن زیتون نہ ملا دیں۔ میں نے پھر استفسار کیا: مولا! کیا گھی یا روغن زیتون کا استعمال ناجائز ہے؟ ارشاد ہوا: ناجائز تو نہیں لیکن ائمہ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ خستہ حال عوام کی صفوں سے وابستہ رہیں تاکہ عسرت و افلاس اس فلاکت زدہ طبقہ کو باغی نہ بنا دے۔ معاویہ نے کہا: احنف! تم نے اس وقت ایسے شخص کی یاد تازہ کر دی جس کے فضائل کا انکار مشکل ہے۔[1]

زمخشری کی ربیع الابرار وغیرہ میں ایسے اور بھی واقعات موجود ہیں۔[2] ہاں! معاویہ کے فساد نفس کو صرف انہی بے ضابطگیوں سے بھلا کہاں قرار مل سکتا تھا، بداعمالیوں کی انتہا تک پہنچنے کی آرزو دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے امام حسن علیہ السلام سے جتنے عہد و پیمان کیے تھے، سب کی خلاف ورزی کی اور بالآخر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لخت جگر کو زہر دلوا دیا۔[3] بعد میں معاویہ نے تمام معاہدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے بیٹے یزید کے لیے جبری بیعت لی۔ اس روش اور ان حادثات کا ردعمل یہ ہوا کہ اسلامی حلقوں میں شام کی سیاست کو نفرت وحقارت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا اور کم از کم ارباب دیانت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ معاویہ قطعی طور پر صرف ایک

---

[1] نشر الدرر ۱: ۳۰۵ [2] ربیع الابرار ۱: ۹۰، ۹۲، ۸۰۷ و ۸۳۵ و ۲: ۲۹۳، ۷۲۰ و ۳: ۷۷، ۸۰ و ۴: ۲۳۹، ۲۴۲۔

[3] مقاتل الطالبین: ۷۳۔ شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید المعتزلی ۱۶: ۴۹۔ الاستیعاب بہامش الاصابۃ ۱: ۳۷۵، مروج الذہب ۳: ۱۸۲، ۱۷۶۰۔

Marfat.com

دنیا دار آدمی ہے!

بلکہ وہ خود اس حقیقت کا معترف تھا۔ فاضل زمخشری کی ربیـــع الابـــرار میں تاجدار دمشق کا یہ قول اب بھی موجود ہے :

ابوبکرؓ نے دنیا سے بچنا چاہا اور دنیا ان سے بچتی رہی ۔ عمرؓ نے دنیا کو آزمایا اور دنیا نے ان کی آزمائش کی۔ رہے عثمانؓ تو انہوں نے دنیا پر خوب قبضہ جمایا۔ مگر دنیا بھی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئی اور میں تو اسے فرش راحت بنانے کے لیے قدم قدم پر جان بچھاتا رہا، بپایان کار میں دنیا کا ہو گیا اور دنیا میری ہو گئی[1]

مختصر یہ کہ ایک طرف تو لوگوں کے رجحانات بدل رہے تھے اور دوسری جانب فی الوقت موجود صحابی جمہور اسلام کو علی علیہ السلام اور اولاد علی علیہ السلام کے ان فضائل سے واقف کرا رہے تھے جو انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے سنے تھے۔ ان خصوصیات کا انکشاف کر رہے تھے جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

وہ منظر کسے یاد نہ ہو گا، کہ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چہیتے نواسوں کو مبارک شانوں پر بٹھائے ہوئے ہیں اور فرماتے جا رہے ہیں :

کیا کہنا تمہاری سواری کا، بہترین سواری ہے اور کیا کہنا تمہارا، بہترین سوار ہو۔

نیز قالب وحی میں ڈھلے ہوئے یہ الفاظ :

حسن و حسین علیہم السلام جوانان جنت کے سردار ہیں۔

کیا رہ کر اپنی اپنی اشاعت کا تقاضا نہ کرتے ہوں گے؟ حقیقتیں پھیلنے کا حق رکھتی ہیں اور احساس حق رکھنے والے انہیں پھیلانے کے آرزومند تھے۔

اس صورت حال کا یہ اثر ہوا کہ عام کلمہ گو تشیع کی جانب مائل ہونے لگے اور اس فرقے کے لیے ترقی کی راہیں کھل گئیں۔

---

[1] ربیع الابرار ۱:۹۰

Marfat.com

سب سے بڑا سبب

لیکن درحقیقت شیعیت کے فروغ کا سب سے بڑا سبب وہ خونچکاں واقعہ ہے جس نے اسلامی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ ۶۱ھ کا یہ دردناک سانحہ جسے المیہ کربلا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اپنی نوعیت کے لحاظ سے تشیّع کی نشر و اشاعت میں بہت مؤثر ثابت ہوا۔ شہادت حسین علیہ السلام کے اثرات نے عمومیت اختیار کر لی۔ زید بن ارقمؓ، جابر بن عبداللہ انصاریؓ، سہل بن سعد ساعدیؓ اور انس بن مالکؓ جیسے صحابہ ابھی زندہ تھے، فرط درد سے تڑپ اٹھے اور بتقاضائے فرض و محبت، فضائل اہل بیت علیہم السلام کی تشہیر میں انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اموی جفاؤں نے ان کا پیچھا کیا اور یہ بقیۃ الصحابہ بھی سیف و سم کا شکار ہوگئے۔ لیکن ؎

آہ مظلوم اثر رکھتی ہے!

یہ واقعات ایسے نہیں تھے کہ قوم ان پر غور نہ کرتی۔ غور کیا اور اچھی طرح، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ لوگ جوق در جوق علی علیہ السلام اور اولاد علی علیہ السلام کا دم بھرنے لگے نیز شیعوں کی عددی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ جس سرعت سے بنو امیہ کا ظلم بڑھ رہا تھا، اسی رفتار سے عام قلوب میں اہل بیت علیہم السلام کی محبت جاگزیں ہوتی جا رہی تھی۔ آل امیہ نے بہت ستایا، جی بھر کے ستم ڈھائے، لیکن ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ لہٰذا اموی مظالم کا بھی ردعمل ہوا اور بڑی شدت سے!

شعبی اپنے لڑکے سے کہتے ہیں:

> بیٹا! دین نے جن قدروں کو بلند کیا، دنیا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ مگر دنیا نے جن چیزوں کو بنایا سنوارا، انہیں دین نے مٹا کر رکھ دیا۔ علی علیہ السلام اور اولاد علی علیہ السلام ہی کے حالات پر غور کر لو۔ امیہ زادوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ ان کی فضیلتوں پر پردے ڈالے، حقیقتوں کو چھپانے کی کوشش کی اور اپنے اسلاف کے گن گانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مگر الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، یعنی آل امیہ کی آبرو مٹی میں مل گئی اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام روشن سے روشن تر ہوتا چلا گیا۔

Marfat.com

شعبی باوجودیکہ علی علیہ السلام کے دشمن کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے، مگر یہ کلمہ حق ان کی زبان سے نکلا اور تاریخوں میں محفوظ ہوگیا۔[1]

مزید اسباب

زمخشری نے ربیع الابرار میں شعبی کا یہ بیان بھی درج کیا ہے:

عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ علی علیہ اسلام سے محبت کرتے تو قتل کا اندیشہ تھا اور عداوت باندھتے تو ہلاکت کا یقین![2]

الغرض مصائب و آلام کا تانتا بندھا رہا۔ یہاں تک کہ سفیانی تخت مروانی حاکم عبدالملک کے قبضے میں چلا گیا۔ معلوم ہے یہ عبدالملک کون تھا؟ اف! وہ شقی جس کے حکم سے حجاج نے خانہ کعبہ کو ڈھا کر اس میں آگ لگائی۔ جوار حرم میں رہنے والوں کو بلا جھجک تہ تیغ کیا۔ عبداللہ بن زبیر کو مسجد الحرام میں قتل کر کے اس مقدس زمین کی حرمت کو خاک میں ملایا۔ اپنے چچازاد بھائی سعید بن اشدق سے عہد و پیمان کر کے اس کی جان لے لی۔

سچ کہنا کلمہ گویو! ایسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والے کو مسلمان بھی کہا جا سکتا ہے؟ چہ جائیکہ خلیفۃ المسلمین؟

الحاصل آل مروان کی پوری حکومت اسی ڈگر پر چلتی رہی اور عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ سب کے یہی نقشے رہے۔

اس کے بعد بنو عباس کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے دور نے تو ماضی کے عصر ستم کو بھی مات دے دی۔

اس وقت کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

یا لیت جور بنی مروان دام لنا
ولیت عدل بنی العباس فی النار

کاش! ہم ہمیشہ آل مروان کی جفائیں سہتے رہتے اور کاش! ان عباسیوں کا عدل و انصاف جہنم واصل ہو جاتا۔

---

[1] البیان فی التفسیر القرآن تالیف سید ابوالقاسم خوئی رحمۃ اللہ: ۵۰۰۔ [2] ربیع الابرار ا: ۴۹۴

Marfat.com

کس بیدردی سے سادات کا خون بہایا گیا، کن کن طریقوں سے انہیں ملیامیٹ کرنے کی کوششیں کی گئیں؟ اس وقت کا ادب دیکھنے سے وہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ شعراء نے مختلف پہلوؤں سے ان کے مظالم کو بے نقاب کیا ہے۔ عہد متوکل کے ایک سخنور نے کتنی سچی تصویر کھینچی ہے۔ کہتا ہے:

تَاللّٰهِ اِنْ كَانَتْ اُمَيَّةُ قَدْ اَتَتْ   قَتْلَ ابْنِ بِنْتِ نَبِيِّهَا مَظْلُوْمًا

فَلَقَدْ اَتَتْهُ بَنُوْ اَبِيْهِ بِمِثْلِهٖ   هٰذَا لَعُمْرُكَ قَبْرُهٗ مَهْدُوْمًا

اَسِفُوْا عَلٰى اَنْ لَا يَكُوْنُوْا شَارَ   كُوْا فِىْ قَتْلِهٖ فَتَتَبَّعُوْهُ رَمِيْمًا

خدا گواہ ہے، اگر آل امیہ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے کو ظلم سے شہید کر ڈالا تو یہ عباسی جو اپنے آپ کو عم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کہتے ہیں، کسی طرح بھی ستم آرائی میں اموی خاندان سے پیچھے نہیں رہے۔ دیکھونا! ان جفا کاروں نے تو مظلوم کی قبر تک منہدم کر ڈالی۔ ہاں ہاں! بنی عباس پچھتاتے ہیں، دست تاسف ملتے ہیں کہ انہوں نے بنوامیہ کے دوش بدوش حسین علیہ السلام کا خون ناحق بہانے میں کیوں حصہ نہ لیا اور اب مظلوم کی لحد مسمار کر کے تلافی مافات کی کوشش کی ہے۔[1]

بنوامیہ آل مروان اور سلاطین عباسیہ کی سیرت کے یہ چند نمونے تھے۔ اب اگر اس کے مقابل آپ علی علیہ السلام اور اولاد علی علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ شیعیت کیوں پھیلی؟ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ تشیع ایرانیوں کی جدت طرازی اور سبائیوں کی کرشمہ سازی ہے یا اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتایا ہوا سیدھا راستہ ہے۔

فرزندان علی علیہما السلام

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد علوی خاندان کے سربراہ امام زین العابدین علیہ السلام ہوئے۔ دنیا جانتی ہے کہ واقعہ کربلا کے اثر سے آپ بالکل گوشہ

---

[1] تاریخ الخلفاء: ۲۷۷۔

Marfat.com

نشین ہوگئے تھے۔ زندگی کا بیشتر وقت یا تو عبادت الٰہی میں گزرتا، یا تربیت اخلاق اور تہذیب نفس کا درس دیتے رہتے تھے۔ حسن بصری، طاؤس یمانی، ابن سیرین اور عمرو بن عبید جیسے مشہور زاہد و عارف اسی مکتب کے فیض یافتہ ہیں۔

اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ سید سجاد علیہ السلام کی اخلاقی درس گاہ سے مسلمانوں کو بروقت اور زبردست مدد ملی، کیونکہ بنائے زمانہ حق اور حقیقت کے راستوں سے کوسوں دور رہ گئے تھے!

عہد زریں

صادق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ نسبتاً موافق تھا۔ کیونکہ اموی اور عباسی حکمران تھک چکے تھے۔ حکومتوں میں اضمحلال پیدا ہوگیا تھا۔ اعلانیہ ظلم وستم کے مواقع ذرا کم ہوگئے تھے۔ بنا بر ایں دبی ہوئی صداقتیں اور چھپے ہوئے حقائق سورج کی طرح ابھرے اور روشنی کی طرح پھیل گئے۔

خوف و خطر کے باعث جو لوگ تقیہ میں تھے، وہ بھی کھل گئے۔ فضا موافق تھی اور راہیں ہموار۔ امام عالی مقام علیہ السلام نے تبلیغ وتلقین میں رات اور دن ایک کر دیے۔ ہاں! تبلیغ کا وہ سلسلہ جس کا تعلق محمد و آل محمد علیہم السلام کی تعلیمات سے تھا، قائم فرمایا۔ درس حق عام ہوا اور لوگ کثرت سے مذہب جعفری قبول کرنے لگے۔ اس عہد کو تشیع کی نشر و اشاعت کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ کیونکہ قبل ازیں عام مسلمانوں نے اس افراط سے اور کھلم کھلا شیعیت کی جانب رجوع نہیں کیا تھا۔

دریائے فیض جاری تھا، تشنگان معرفت خود بھی سیراب ہوتے تھے اور دوسرں کی بھی پیاس بجھاتے تھے۔ بقول ابوالحسن وشاء:

> میں نے اپنی آنکھوں سے مسجد کوفہ میں چار ہزار علماء کا مجمع دیکھا ہے اور سب کو یہ کہتے سنا: حدثنی جعفر بن محمد۔ یعنی یہ روایت مجھ سے جعفر صادق علیہ السلام نے بیان فرمائی۔[1]

بہر کیف بنو امیہ اور بنو عباس کی بے پناہ جاہ طلبی، طوفانی تشدد، حد سے گزری

---

[1] رجال النجاشی: ۴۰: ۸۰

Marfat.com

ہوئی دنیا پرستی پھر لامحدود رنگ رلیاں اوراس کے برعکس فرزندان علی علیہ السلام کی علم دوستی، عبادت گزاری، حق پسندی اور غلط سیاست سے احتراز، یہ ایسے صریح اور قوی عوامل تھے جو تشیع کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔

دیکھیے! یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ دنیاوالے جی بھر کر دنیا پر جان چھڑکتے ہیں، لیکن اس کے باجود ان کے دلوں میں علوم ومعارف اور امور دین کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور ہم جس زمانے کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ تو عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب بھی تھا نیز مسلمانوں کے دل و دماغ ان تاثرات سے مملو تھے کہ اسلامی نظام زندگی بے شمار برکتوں کا حامل ہے۔ قرآنی تعلیم سے انہیں وہ فیوض حاصل ہوئے جن کا تصور بھی قبل ازیں ان کے لیے محال تھا۔ قیصر و کسریٰ کو اسلام ہی نے فتح کیا۔ اسلام ہی کے نام پر وہ شرق وغرب عالم کے مالک بنے۔ علاوہ اس کے یہ بھی جانتے تھے کہ اس مذہب میں کافی حدتک وسعت نظر موجود ہے۔ طریقے جائز ہوں تو یہ دنیاوی مال و متاع حاصل کرنے سے بھی کسی کو نہیں روکتا۔ یہ دین کیا ہے، سراپا رحمت ہے!

غرضیکہ یہ قلبی احساسات چھپے ہوئے ٹہوکے تھے جو عوام کو علوم دین کی جانب متوجہ کرتے رہے۔

رغبت کامل نہ سہی، لیکن قدرے شوق ضرور ابھرا ہوگا۔ کچھ چاہتے ہوں گے کہ ہم اپنی حیات اجتماعی کو احکام شریعت کی روشنی میں سنوار لیں۔ بعضوں کی یہ تمنا ہو گی کہ ہمارا معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگ جائے اور کسی کو یہ ارمان ہو گا کہ کم از کم ہماری گھریلو زندگی ہی صحیح قوانین کے مطابق ہو جائے۔ مگر یہ معارف حاصل کہاں سے کرتے؟ ان کجکلاہوں کے دربار سے؟ جو خلیفۃ المسلمین کے تمغے لگائے ہوئے تھے اور بس۔ لیکن وہاں تو ان قدروں کا گزر بھی نہ تھا!

پھر کدھر جاتے؟ ہاں! جنہوں نے ڈھونڈا، انھوں نے پایا اور ان کی مراد پوری ہوئی۔ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کا مخزن اور دانش و آگہی کا معدن تھے۔ ان ہی خوبیوں کے باعث عوامی ذہن پر نہ صرف ان کی برتری کے نقوش ثبت ہو گئے بلکہ یہ عقیدہ بھی مسلمانوں کے لیے دلنشین ہوتا چلا گیا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے وارث یہی ہیں اور امامت ان ہی کا حق ہے۔

Marfat.com

خلوص کامل

پھر یہ عقیدہ اس درجہ مستحکم ہوتا گیا کہ اس جماعت میں شریک ہونے والے دنیا کے ہر خطرے کو ہیچ سمجھنے لگے۔ اکثر شیعہ تو عملی طور پر اتنے جری، جاں باز اور احساس فدویت سے سرشار نظر آتے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں ۔ مثلاً حجر بن عدی کندی، عمرو بن حمق خزاعی، رشید ہجری، میثم تمار اور عبد اللہ بن عفیف ازدی وغیرہم۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مختلف مواقع پر باطل پرستوں سے باقاعدہ ٹکر لی اور اچھا خاصا مقابلہ کیا۔ اگرچہ مخالف عنصر مادی اعتبار سے کافی مضبوط تھا، مگر ان کی اخلاقی قوت نے وہ کر دکھایا جو بڑے سے بڑا لشکر سے بھی نہ کر سکتا۔ یعنی ان کی قربانیوں سے ایک طرف تو قصر ستم میں زلزلہ آ گیا اور دوسری جانب عوامی ذہن وفکر کے رخ بدل گئے۔

اب کوئی بتائے کہ یہ سرفروش کیوں اس طرح موت سے کھیلتے رہے؟ آل محمد علیہم السلام سے کسی دنیاوی فائدے کی امید تھی؟ یا جان و مال کا خوف لاحق تھا؟ تاریخ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دے گی۔ کیونکہ فرزندان مرتضی علیہا السلام تو مادی وسائل کے اعتبار سے خود ہی بے چارگی کے عالم میں تھے، لہٰذا کیا دیتے اور کیا لیتے؟ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان مجاہدوں کے نورانی دل، یقین محکم اور خلوص کامل کے پاکیزہ جذبوں سے معمور تھے اور یہی جذبے وقت پر بھرے دریا کی طرح امڈنے لگتے تھے۔ علاوہ ازیں پہلی اور دوسری صدی ہجری کے ادباء پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ امید و بیم کے باوجود شعرائے وقت، شاہان عصر اور ان کی بے راہروی سے بیزاری کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اہل بیت مصطفوی علیہم السلام کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ حالانکہ شاعر اپنے بنتے بگڑتے کو زیادہ دیکھتا ہے۔ مگر بایں ہمہ اس کے افکار خلفائے زمانہ کے خلاف اور ائمہ حق کے موافق ظاہر ہوتے ہیں۔

فرزدق، کمیت، سید حمیری، دعبل، دیک الجن، ابی تمام البحتری اور ابی فراس حمدانی تک غور کرتے چلے آیئے، سب کے سب عترت طاہرہ (ع) کی مدح و ثنا میں ڈوبے ہوئے ملیں گے۔ ابو فراس (متوفی ۳۵۷ھ) کے مقبول عام قصیدے کا یہ شعر:

الدِّیْنُ مُخْتَرَمٌ وَالْحَقُّ مُهْتَضَمٌ وَفِیْءُ آلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ مُقْتَسَمٌ

Marfat.com

دین ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، حق نشانہ ستم بن گیا اور آلِ رسول کا حصہ آپس میں بانٹ لیا گیا زبان حال سے واضح کر رہا ہے کہ اس عہد کے ادیبوں پر کیا اثر تھا۔

دعبل کہتے ہیں:

چالیس برس سے میں اپنی موت کا سامان (تختہ دار) لیے پھر رہا ہوں، مگر ابھی تک کسی نے قاتل بننا منظور نہیں کیا۔

دعبل نے رشید، امین، مامون اور معتصم کی خوب خوب ہجو کی اور اس کے برعکس امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم اور امام رضا علیہم السلام کی شان میں بڑے بڑے قصیدے نظم کیے جو بہت مشہور ہیں۔

آخر یہ تمام کے تمام بے سبب اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے تھے؟ بے مقصد اپنے عیش و آرام کو مٹی میں ملا رہے تھے؟ کوئی تو وجہ ہو گی؟

جب ہم اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہیں تو آثار اس کے سوا اور کچھ نہیں بتاتے کہ یہ آلِ رسول علیہم السلام کی صداقت تھی جو سوچنے سمجھنے والے دماغوں کو سر بفلک زریں ایوانوں سے متنفر اور آیہ مودت کی جانب مائل کرتی جا رہی تھی۔

یہ سلسلہ اور آگے بڑھ سکتا ہے مگر ایضاح مطلب کے لیے مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ بس! اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ تشیع کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق چند حقائق معلوم ہو جائیں اور غالباً اس ضمن میں کوئی بات مبہم نہیں رہی ہو گی۔ ایک سچی روداد تھی جسے نہایت اختصار کے ساتھ ہم نے پیش کر دیا اور پھر اعادہ کیے دیتے ہیں کہ شیعیت کا آغاز خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں ہوا اور اس کی نشر و اشاعت حالات و واقعات کی ایک زنجیر ہے، جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے مربوط اور اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے، جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے متصل ہے۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

چند ضروری باتیں

نظری اور عملی مسائل

قبل اس کے کہ ہم اصول و فروع کو جدا جدا مباحث میں بیان کریں، مجموعی طور پر تمام مسائل کو عمومی اعتقاد کے مطابق پانچ کلیات پر منقسم کرتے ہیں:

۱۔ خالق کی معرفت۔

۲۔ اس کے مبلغ کی شناخت۔

۳۔ مسائل عبادت اور طریق عمل کی پہچان۔

۴۔ نیکیوں کا حصول اور برائیوں سے اجتناب۔

۵۔ معاد اور سزا و جزا کا اعتقاد۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ [۱]

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

اس لحاظ سے دین کے دو شعبے ہوئے: نظری اور عملی۔ عام اعتبار سے اسلام و ایمان مترادف ہیں۔

توحید، نبوت اور معاد اسلام کے تین بنیادی رکن ہیں۔ اگر کوئی شخص ان ارکان میں سے کسی رکن کا منکر ہو تو نہ وہ مسلم ہے نہ مومن۔ جو کوئی خدا کی توحید، سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو: مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَالْیَوْمِ الآخِرِ، فَھُوَ مُسْلِمٌ حَقّاً تو وہ مسلمان ہے اس کی جان، مال اور عزت مسلمانوں پر اور مسلمانوں کی اس پر حرام ہے اور اگر ان ارکان پر ایمان لے آئے تو اس

---

[۱] آل عمران:۱۹

Marfat.com

کا شمار مسلمانوں میں ہوگا اور اسے مسلمانوں کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔

لفظ ایمان سے ایک خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مزید ایک رکن کا اضافہ۔ یعنی ان فرائض کی تعمیل جن پر اسلامی نظام کا دار و مدار ہے۔ ان فرائض کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ نماز ۲۔ روزہ ۳۔ زکوٰۃ ۴۔ حج ۵۔ جہاد

لیکن اس لحاظ سے یہ تصریح:

الایمان: اعتقاد بالجنان و اقرار باللسان و عمل بالارکان۔[۱]

قلبی اعتقاد، زبانی اقرار اور ارکان پر عمل کرنے کا نام ہے ایمان۔

مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَ عَمِلَ صَالِحاً

قرآن میں تمام مقامات پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان اور روز آخرت پر ایمان کا تذکرہ ہوا ہے۔ یعنی پہلے مقام پر ایمان سے مراد اسلام اور اعتقاد ہے، جب کہ دوسرے مقام پر ایمان سے مراد عمل صالح ہے۔

یہ تقسیم پروردگار عالم کی اس ہدایت پر مبنی ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ[۲]

بدوی لوگ کہتے ہیں؛ ہم ایمان لائے ہیں۔ کہہ دیجیے: تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یوں کہو: ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔

مزید توضیح کے لیے دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

---

۱ نہج البلاغۃ ۳: ۲۰۳، ۲۲۷، عیون اخبار الرضا (ع) ۱: ۲۲۶۔۱ و۲۔ امالی الشجری ۱: ۲۴، جامع الاخبار: ۱۰۳، ۱۷۲۔ سنن ابن ماجہ ۱: ۲۵، ۶۵۱۔ الفردوس بمأثور الخطاب ۱: ۱۱۰۔ ۳۷۱۔

۲ الحجرات: ۱۴

Marfat.com

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ [1]

مومن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں پھر شک نہ کریں اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کریں۔ یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آخرت پر یقین (قول) اور رسول کے بتائے ہوئے احکام پر عمل (فعل) کے مجموعے کا نام ہے ایمان۔ بہرحال یہ تو تھا تمام مسلمانوں کے اساسی نظریات کا خلاصہ۔

مگر شیعہ! ان ارکان کے ساتھ ایک اور رکن کو جزو ایمان قرار دیتے ہیں۔ یہ بنیادی مسئلہ، عقیدۂ امامت ہے جو عقیدۂ نبوت کی طرح ہے۔

منصب الٰہی

شیعی نقطہ نظر کے مطابق امامت، نبوت کی طرح منصب الٰہی ہے۔ جس طرح خداوند عالم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نبوت و رسالت کے جلیل القدر عہدہ کے لیے منتخب کرتا ہے اور معجزے کے ذریعے اس کی تائید کرتا ہے۔ اسی طرح امامت کے معاملے میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں کہ یہ منصوص من اللہ ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ [2]

اور آپ کا پروردگار جسے چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور منتخب کرتا ہے۔ انہیں انتخاب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

خود رب العزت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ وہ ''شخص منتخب'' کی امامت کا اعلان کر دے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب الحکم فرائض شریعت کی تکمیل کے لیے نص کے ذریعہ اس منتخب کی ہوئی ہستی کو خلق کا پیشوا بنا دیتے ہیں۔ نبی اور امام میں فرق صرف یہ ہے کہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام خصوصی توفیق کے ساتھ رسول سے احکام حاصل کرتا ہے۔

---

[1] الحجرات: ۱۵ [2] القصص: ۶۸

Marfat.com

پس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اک پیام رساں ہے، اور امام رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیام بر!

انحصار: امامت تسلسل کے ساتھ بارہ ذوات مقدسہ میں منحصر ہے۔ ہر امام نے ہونے والے امام کو نص کے ذریعے مقرر کیا۔

عصمت

انبیاء کی طرح آئمہ بھی معصوم ہوتے ہیں تا کہ امکان خطا باقی نہ رہے۔

فرمان خداوندی:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ [1]

اس نے کہا میں تم کو خلق کا امام بنانے والا ہوں۔ (ابراہیمؑ نے) عرض کی اور میری اولاد میں سے، ارشاد ہوا: میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی فائز نہیں ہوسکتا۔

عصمت، امام کی روشن دلیل ہے۔

فضیلت: علاوہ ازیں امام تمام علوم و صفات کے لحاظ سے سارے زمانے پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مقصد امامت ہی یہ ہے کہ انسانی دنیا کو منزل کمال تک پہنچایا جائے اور نفوس بشری کو علم و عمل صالح سے سنوارا جائے۔

نبوت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ [2]

وہی تو ہے جس نے امیوں میں ان ہی کا ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس کا انطباق امام علیہ السلام پر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی ناقص کسی کو کامل نہیں

---

[1] البقرة: ۱۲۴ [2] جمعہ: ۲

Marfat.com

بنا سکتا۔ جو خود کچھ نہ رکھتا ہو وہ دوسروں کو کیا دے گا؟

آن خویشتن گم است کرا رہبری کند؟

لہٰذا امام علیہ السلام کمالات کے اعتبار سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے **قدرے کم**، اور بشر سے بہت بلند ہوتا ہے۔

مومن و مسلم: چنانچہ مذکورہ مفہوم کے مطابق اگر کوئی شخص امامت کا قائل ہو تو وہ شیعی روایات کے لحاظ سے خاص معنوں میں مومن کہلاتا ہے اور اگر صرف ان ہی چار ارکان (توحید، نبوت، معاد اور احکام پر عمل) کا اقرار کرے جو عام مسلمانوں کا مرکز اعتقاد ہیں تو اسے عام معنوں میں مسلم و مومن کہیں گے اور جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام اسلامی احکام اس پر مرتب ہوں گے۔ اس کی جان، مال اور عزت و آبرو وغیرہ کا احترام فرض ہے۔ اس کی حفاظت واجب اور غیبت حرام ہے۔ کیونکہ صرف امامت کا اقرار نہ کرنے سے کوئی فرد اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔

البتہ قیامت کے دن معلوم ہوگا اور قرب و کرامت کی منزلوں میں امامت کا یہ عقیدہ اپنا اثر دکھائے گا۔ دنیا میں تمام مسلمان یکساں اور ایک دوسرے کے کفو ہیں۔ ہاں آخرت میں ضرور درجوں کا تفاوت ہوگا۔ عمل اور نیت کے اعتبار سے مقامات ملیں گے۔ خیر! آخری فیصلہ تو خدا کے ہاتھ ہے، ہم ان بحثوں میں کیوں پڑیں؟

امامیہ

اچھا تو ابھی یہ وضاحت کی جا رہی تھی کہ عام مسلمانوں میں شیعوں کو جو امتیازی حیثیت حاصل ہے وہ اس وجہ سے کہ یہ ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی امامت کے معتقد ہیں اور اسی بنا پر اس فرقہ کو امامیہ کہتے ہیں۔

اس کا خیال رہے کہ تمام شیعہ امامیہ نہیں ہیں۔ کیونکہ لفظ شیعہ کا اطلاق زیدیہ، اسماعیلیہ، واقفیہ اور فطحیہ وغیرہم پر بھی ہوتا ہے اور یہ تو وہ فرقے ہیں جو مسلمانوں میں شامل ہیں۔ لیکن اگر ہم دامن نظر کو ذرا اور پھیلا دیں تو بہت سے ایسے فرقے بھی ملیں گے جو دائرہ اسلام سے قطعاً خارج ہیں مگر پھر بھی شیعہ کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خطابیہ وغیرہ اور اس طرح سو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ

Marfat.com

فرقوں کی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں شیعہ کا نام امامیہ فرقے سے ہی مختص ہو چکا ہے، جو اہل سنت کے بعد عالم اسلام کا سب سے بڑا فقہی مکتب ہے۔

أئمہ اثناعشر

اسلامیات میں أئمہ اثناء عشر کا عقیدہ کچھ نیا نہیں، مسلمانوں کی جملہ معتبر و مستند کتب میں یہ ذکر خیر موجود ہے۔ امام مسلم و بخاری نے اپنی صحاح میں متعدد طریقوں سے حدیث اثنیٰ عشر کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے چند احادیث درج کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہوں:

۱۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں:

میں ایک مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یہ نظام اس وقت تک ختم ہونے والا نہیں جب تک کہ بارہ خلفاء نہ گزر جائیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آہستہ سے کچھ فرمایا جو میں سن نہ سکا۔ اپنے باپ سے دریافت کیا کہ اس کے آگے سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا؟ جواب ملا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: یہ سب قریش سے ہوں گے

۲۔ دوسری روایت ہے:

جب تک بارہ مقتدر رہیں گے یہ معاشرہ یونہی برقرار رہے گا۔

۳۔ تیسری حدیث

جب تک بارہ خلفاء ہیں اسلام کی شان و شوکت باقی رہے گی۔[1]

---

[1] محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی "صحیح" کی چوتھی جلد باب الاستخلاف میط کتاب الاحکام کے صفحہ ۱۶۴ پر اور مسلم بن حجاج القشیری نے اپنی "صحیح" کی دوسری جلد کتب الامارہ کے صفحہ ۱۱۹ پر ان احادیث کی تفصیل دی ہے (نجفی)۔ سنن ترمذی کتاب الفتن۔ مسند احمد ۱: ۳۹۸، ۴۰۶، و ۵: ۸۶، ۹۰، ۹۳، ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۰۷۔ المعجم- الکبیر للطبرانی ۲: ۲۱۴۔

Marfat.com

اب خدا جانے یہ بارہ خلیفہ کون ہیں؟ سواد اعظم میں تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول مشہور ہے:

میرے بعد خلافت تیس برس رہے گی۔ پھر حرص و آز اور مکر و فریب کی آماجگاہ بن جائے گی۔

یہاں ہمیں بحث و استدلال سے مطلب نہیں، صرف عقائد سے غرض ہے۔ اگر کوئی ائمہ اثناء عشر علیہم السلام کی امامت کا تفصیلی ثبوت چاہتا ہے تو ہماری ان ہزاروں کتب کا مطالعہ کرسکتا ہے جو علم کلام میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

بنیادی نظریات

شیعی نقطہ نظر سے مذہب دو شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے: علم اور عمل۔ یعنی کچھ مسائل کا تعلق عقل سے ہے اور کچھ مسائل جسم سے متعلق ہیں۔ وہ مسئلے جن کا تعلق علم یعنی عقل سے ہے، انہیں اصول دین سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان کی تعداد پانچ ہے:

۱۔ توحید ۲۔ نبوت ۳۔ امامت ۴۔ عدل ۵۔ معاد

اب ہم ہر مبحث پر علیٰحدہ علیٰحدہ روشنی ڈالتے ہیں:

توحید

امامیہ عقائد کے لحاظ سے ہر ہوش مند کا عقلی فریضہ ہے کہ وہ اپنے آفریدگار کو پہچانے۔ اس کی معرفت حاصل کرے اور اس کی وحدانیت و الوہیت کا معتقد ہو۔ ربوبیت میں کسی کو اس کا شریک قرار نہ دے۔ اس کا یقین رکھے کہ خلق و رزق، موت و حیات اور ایجاد و اعدام اسی کی ذات سے متعلق ہے، بلکہ اس عالم ہست و بود میں صرف اسی کی قدرت کاملہ کا عمل دخل ہے۔

اور اگر رزق و خلق یا موت و حیات کو کوئی شخص خدا کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرے تو اسے کافر و مشرک اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اطاعت و عبادت میں اخلاص ضروری ہے۔ یعنی اگر کوئی معبود مطلق کے ساتھ کسی اور شے کی عبادت بجا لائے، اس کے سوا کسی اور کی پرستش کرے نیز اسے تقرب کا وسیلہ بنائے تو وہ بھی امامیہ مذہب کے حکم سے کافر متصور ہوگا۔

Marfat.com

سوائے خدائے وحدہ لاشریک کے کسی کی عبادت جائز نہیں۔ نیز ذات باری تعالیٰ، انبیائے کرام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے علاوہ کسی اور کی اطاعت بھی روا نہیں۔

انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی اطاعت بھی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ یہ احکام الٰہی کے مبلغ ہیں۔ لیکن خدا کی عبادت سمجھ کر ان کی عبادت کرنا جائز نہیں ہے اور قطعاً شیطانی فریب!

البتہ ان ذوات مقدسہ سے طلب برکت اور انہیں اپنے اور اپنے معبود کے درمیان وسیلہ قرار دینا نیز ان کے مزاروں پر اللہ کی عبادت بجا لانا جائز ہے، کیونکہ یہ پرستش ان کی نہیں، خدا کی ہے اور یہ ایک واضح سا فرق ہے۔ حسب ارشاد باری تعالیٰ:

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ[1]

وہ گھر جنہیں اللہ نے بلند ہونے کی اجازت دی اور ان میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔

ان پاکیزہ بارگاہوں میں معبود برحق کی عبادت درست ہے۔ یہ ہے امامیہ فرقے کا عقیدۂ توحید، جس پر ہمارے تمام علماء متفق و متحد ہیں، بلکہ ہم نے جتنا بیان کیا ہے، مسئلہ وحدانیت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کے کئی درجے قرار دیے گئے ہیں۔ مثلاً توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال وغیرہ۔ چونکہ ہمیں اختصار کا لحاظ ہے، بنا بریں طوالت سے دامن بچا رہے ہیں۔

نبوت

نبوت کے بارے میں امامیہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء جو منصوص من اللہ ہیں، وہ سب کے سب خدا کے فرستادہ اور اس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ سب دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء اور سید المرسلین ہیں۔ آپؐ بالکل معصوم تھے۔ سرکار سے نہ کوئی گناہ سرزد ہوا نہ لغزش۔ زندگی بھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرضی حق کے مطابق عمل کرتے رہے۔

مالک مطلق نے آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔ وہاں سے

---

[1] النور: ۳۶

Marfat.com

آپ اپنے جسم مبارک کے ساتھ عرش و کرسی نیز ماورائے حجب و سرادق تک پہنچے اور اپنے معبود سے اتنے قریب ہوگئے کہ قاب قوسین بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

اللہ کی وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگار عالم نے معجزہ بنا کر آپؐ پر نازل کیا اور اس کے ذریعے احکام دین کی تعلیم دی۔ اس میں کوئی نقص ہے اور نہ کمی، نہ زیادتی۔ مسلمانوں میں جو لوگ اس میں نقص و تحریف کے قائل ہیں، وہ خطا پر ہیں، کیونکہ اس اعتقاد سے نص کتاب:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ[1]

اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کی تردید ہوتی ہے۔

تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اس قرآن میں نقص یا تحریف کی کوئی روایت ملے بھی تو وہ غیر معتبر ہوگی۔ کیونکہ جو احادیث طریق آحاد سے دستیاب ہوتی ہیں وہ مفید علم و عمل قرار نہیں پا سکتیں۔ بالفاظ دیگر ان کا کوئی اعتبار نہیں اور انہیں دیوار پر دے مارو۔

نیز شیعہ امامیہ کا یہ عقیدۂ راسخہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو کوئی بھی نبوت یا نزول کتاب یا وحی کا دعویٰ کرے وہ کافر اور واجب القتل ہے۔

امامت

امامت! یہی وہ امتیازی مسئلہ ہے جس کی بنا پر شیعہ فرقہ عام فرقوں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے اور یہی وہ اساسی اور بنیادی فرق ہے جو اس مکتب کو عام مکاتب سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں، ان کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ فروعی ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور ضمنی اختلافات خود سواد اعظم کے ائمہ اجتہاد میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً حنفیوں کے بہت سے مسائل شافعیوں سے میل نہیں کھاتے اور ان کے ان سے۔

امامیہ فرقے کے نزدیک امامت وہ الٰہی منصب ہے جو نبوت کی طرح پروردگار

[1] الحجر: ۹

Marfat.com

عالم کی جانب سے ہدایت خلق کے لیے عطا ہوتا ہے۔

ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب باری عز اسمہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کریں تاکہ ختم نبوت کے بعد کار تبلیغ جاری رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم تھا کہ یہ عہدہ لوگوں کو کھٹکے گا۔ اکثر اسے بھائی کی چاہت اور داماد نوازی پر محمول کریں گے اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ اس زمانے سے لے کر آج تک مسلمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واقعی بے لوثی اور حقیقی عصمت کے معاملے میں متحد الایمان نظر نہیں آتے، لیکن قدرت نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی اور بالکل صاف صاف لفظوں میں حکم دیا:

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ[1]

اے رسول (ص)! تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس کا فوراً اعلان کر دو اور اگر مفوضہ کام کی انجام دہی میں ذرا تساہل برتا تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم نے کار رسالت انجام ہی نہیں دیا۔

اس صورت میں سوائے تعمیل حکم کے اور کیا چارہ تھا؟ چنانچہ آپؐ نے حجۃ الوداع کے بعد غدیر خم میں لوگوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا:

أَلَسْتُ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ

کیا میں تمام مومنین سے اولیٰ نہیں ہوں؟ یعنی میری ذات سب پر مقدم نہیں ہے؟

پورے مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا:

بے شک رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہم سب سے اولیٰ ہیں۔

ان گواہیوں کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔

جن لوگوں نے میری ولایت کو تسلیم کیا، یہ علی علیہ السلام بھی ان کا

---

[1] المائدۃ: ٦٧

Marfat.com

ولی امر ہے ...تا آخر خطبہ[1]

اس کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر اس حقیقت کی توضیح و تصریح فرمائی ہے۔ گاہے اشاروں اشاروں میں اور کبھی کھلم کھلا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ حکم خدا کی تعمیل ہوگئی۔

لیکن ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی بعض دیدہ دلیر مسلمان حقیقت پر پردہ ڈالنے کے درپے ہوگئے۔ نص صریح کی تاویل کی گئی اور اپنے اجتہاد سے احکام میں تغیر و تبدل کرنے لگے۔ نتیجتاً جو ہوا ظاہر ہے۔

بہر حال! علی علیہ السلام اور ان کا گروہ جو بڑے بڑے جلیل القدر اصحاب پر مشتمل تھا، اس خود ساختہ روش سے علیحدہ رہا اور اس جماعت کے ہر فرد نے بیعت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام مصالح دینی کے پیش نظر ایک زمانے تک تو خاموش رہے، مگر جب معاویہ نے اسلامی حکومت و اقتدار کو اپنے زیر نگیں کرنا چاہا اور اس ضمن میں اس نے مختلف تخریبی کاروائیاں شروع کر دیں تو علی بن ابی طالب علیہ السلام معارض ہوئے۔ کیونکہ معاویہ جیسے شخص کی موافقت اور اس کے غلط طرز حکمرانی کو طرح دینا اسلامی مفاد کے لیے زہر ہلاہل تھا اور دین الٰہی کی حفاظت علی علیہ السلام کا سب سے بڑا فرض!

مختصر یہ کہ امامیہ حضرات اس امر کے معتقد ہیں کہ ہم علی علیہ السلام کے ساتھی ہیں اور آپؑ ہی کے پیرو۔ علی علیہ السلام جس کے دوست، ہم اس کے دوست اور علی علیہ السلام جس کے دشمن ہم اس کے دشمن!

یہ اعتقاد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر مبنی ہے:

اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاہُ.

---

[1] اس موضوع پر حجۃ الاسلام شیخ عبدالحسین امینی مرحوم کی انسائیکلو پیڈیائی تصنیف الـغـدیـر کی ۱۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ قابل دید کتاب ہے نیز ملاحظہ فرمائیں: سنن ابن ماجہ ۱: ۴۳، ۱۱۶ و ۴۵، ۱۲۱۔ سنن ترمذی ۵: ۶۳۳، ۳۷۱۳، خصائص الامام علی علیہ السلام للنسائی: ۹۶، ۷۹ و ۹۹، ۸۳، مسند احمد ۱: ۸۴، ۸۸ و ۴: ۳۶۸، ۳۷۲ و ۵: ۳۶۶، ۴۱۹۔ تاریخ بغداد ۷: ۳۷۷ و ۸: ۲۹۰ و ۱۲: ۳۴۳۔ اسد الغابۃ ۲: ۲۳۳ و ۳: ۹۳، الاصابۃ ۱: ۳۰۴، مستدرك الحاكم ۳: ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۶، کفایۃ الطالب: ۶۴، ترجمۃ الامام علی علیہ السلام من تاریخ دمشق ۲: ۵، ۵۰۱، ۵۳۱۔ الریاض النضرۃ ۲: ۱۷۵، المناقب للمغازلی ۱۶، ۲۶۔ مصنف ابن ابی شیبۃ ۱۲: ۵۹، ۱۲۱۲۱ اور بہت سی دیگر۔

Marfat.com

پروردگار! جو علی علیہ السلام کا دم بھرے تو اسے دوست رکھ اور جو علی علیہ السلام سے بغض باندھے تو بھی اس سے دشمنی کر۔

امامیہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خلاق عالم صفحہ ہستی کو کبھی کسی نبی یا وصی کے وجود سے خالی نہیں رکھتا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ حجت ظاہر ہو یا غائب! سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نص صریح کے ذریعہ علی مرتضیٰ علیہ السلام کو اپنا وصی بنایا۔ علی علیہ السلام نے حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو جانشین کیا اور امام حسن علیہ السلام نے اپنے بھائی سید الشہدا امام حسین علیہ السلام کو یہ امانت سپرد کی۔ اس طرح یہ سلسلہ گیارہویں امام تک پہنچا۔ گیارہویں رہبر امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے بارہویں امام حضرت مہدی منتظر سلام اللہ علیہ کو صاحب الامر قرار دیا۔ یہ اعتقاد شیعوں کی اُپج نہیں بلکہ ایک سنت الہیہ ہے جو آدم علیہ السلام سے خاتمؐ تک پہنچی۔

اس موضوع پر اعاظم علماء کی بے شمار کتب موجود ہیں۔ ہم قرون اولیٰ اور صدر اول کے ان چند ممتاز علماء کے نام درج کرتے ہیں جنہوں نے وصیت کے عنوان پر قلم فرسائی کی ہے۔

۱۔ الوصیة ہشام بن الحکم المشہور

۲۔ الوصیة حسین ابن سعید

۳۔ الوصیة حکم بن مسکین

۴۔ الوصیة علی بن مغیرہ

۵۔ الوصیة علی بن الحسین بن الفضل

۶۔ کتاب الوصیة محمد بن علی بن الفضل

۷۔ کتاب الوصیة ابراہیم بن محمد بن سعید بن ھلال

۸۔ الوصیة احمد بن محمد بن خالد البرقی صاحب المحاسن

۹۔ الوصیة مورخ جلیل عبدالعزیز بن یحییٰ الجلودی

ان میں سے اکثر لکھنے والے قرن اول اور قرن دوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ تیسری صدی ہجری کے مؤلفات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ مثلاً:

۱۔ الوصیة علی بن رباب

Marfat.com

۲۔ الوصیۃ عیسیٰ بن مستفاد

۳۔ الوصیۃ محمد بن احمد الصابونی

۴۔ الوصیۃ محمد بن الحسن بن فروخ

۵۔ کتاب الوصۃ و الامامۃ مورخ الثبت الجلیل علی بن الحسین مسعودی صاحب مروج الذہب

٦۔ الوصیۃ شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی

۷۔ الوصیۃ محمد بن علی الشلمغانی المشہور

۸۔ الوصیۃ)) موسیٰ بن الحسن بن عامر

اور چوتھی صدی ہجری کے بعد جو کتب تالیف ہوئی ہیں ان کا تو شمار ہی مشکل ہے۔

مسعودی اپنی مشہور کتاب اثبات الوصیۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

ہر نبی کے بارہ وصی ہوئے!

مؤلف نے سب کے نام اور مختصر حالات بھی قلم بند کیے ہیں اور آخر میں ائمہ اثناء عشر کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ایران میں چھپ چکی ہے۔

وجود حجت

البتہ وجود حجت کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں حلقوں سے شیعوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ لہٰذا چند جملوں میں ہم اس حقیقت کی بھی توضیح کرتے چلیں۔

معترضین کا خیال ہے کہ شیعہ ایک بے بنیاد مضحکہ خیز عقیدے کے قائل ہیں۔ لیکن جب ہم اعتراض کرنے والوں کی فکر کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نافہمیدہ سوالوں پر مبنی ہے:

☆ پہلا سوال یہ کہ طبعی طور پر ایک شخص ہزار برس سے زیادہ کیسے جی سکتا ہے؟

☆ دوسرا سوال یہ کہ آپ کے غائب ہونے میں کون سی مصلحت کارفرما ہے؟ اور ایک غائب امام کے وجود سے فائدہ؟ ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

Marfat.com

پہلے اشکال کے متعلق ترقیم ہے کہ ذرا عمر نوح علیہ السلام کا خیال رہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا[1]

اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس (پیغمبر بنا کر) بھیجا تو وہ ان میں پچاس کم ہزار برس رہے۔

قرآنی تصریحات کے مطابق جناب نوح علیہ السلام نے نو سو پچاس برس اپنی قوم میں گزارے اور علماء نے آپ کی عمر کا جو اندازہ لگایا وہ کم سے کم ایک ہزار چھ سو سال ہے اور بہت سے دیدہ ور افاضل تو تین ہزار برس کی خبر لائے ہیں۔[2]

حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ بھی جمہور کے علمائے حدیث دوسری ہستیوں کی درازی عمر کا اقبال کرتے ہیں۔ محدث کبیر نووی اپنی کتاب تہذیب الاسماء میں ذکر فرماتے ہیں کہ جناب خضر علیہ السلام کی عمر اور نبوت کے ضمن میں اگرچہ علماء مختلف الرائے ہیں لیکن محققین کی اکثریت اس امر کی معترف ہے کہ جناب خضر علیہ السلام موجود ہیں اور صوفیائے کرام تو بالاتفاق آپ کی حیات پر مصر ہیں۔ چنانچہ آپ کے دیدار، ملاقاتوں اور سوال وجواب وغیرہ کی ان گنت حکایات مشہور ہیں۔

شیخ ابو عمرو بن صلاح نے اپنے "فتاویٰ" میں تحریر کیا ہے کہ جناب خضر علیہ السلام کے بارے میں جمہور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ زندہ ہیں لیکن بعض محدثین اس کا اقرار نہیں کرتے۔[3]

اور خیال پڑتا ہے کہ ایک دوسرے موقع پر موصوف یوں رقم طراز ہیں نیز زمخشری نے بھی ربیع الابرار میں تحریر کیا ہے:

تمام مسلمان متفقہ طور پر چار انبیاء کی حیات اور وجود کے قائل ہیں۔ ان میں سے دو آسمان پر ہیں۔ یعنی عیسیٰ اور ادریس علیہما السلام اور دو زمین پر ہیں، خضر اور الیاس علیہما السلام۔

جناب خضر علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ ابوالانبیاء علیہ السلام کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔[4]

---

[1] عنکبوت: ۱۴

[2] تفسیر کشاف للزمخشری ۳: ۲۰۰۔ تفسیر لابن کثیر ۳: ۴۱۸، زاد المسیر ابن جوزی ۶: ۲۶۱۔

[3] تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۷۶۔ [4] حوالہ سابق ۱: ۱۷۷۔ ربیع الابرار ۱: ۳۹۷۔

Marfat.com

ایسی بہت سی دیگر شخصیتیں بھی ہیں جنہوں نے عمر طبیعی کی حدیں گزار کر زندگی کی سینکڑوں بہاریں دیکھیں۔ جن میں سے کچھ لوگوں کا تذکرہ علامہ سید مرتضیٰ (قدس سرہ) نے اپنی کتاب امالی[1] میں کیا ہے اور صدوق نے اکمال الدین[2] میں اس سے بھی زیادہ طویل فہرست درج فرمائی ہے۔

عہد حاضر میں بھی ایسے اشخاص مل جاتے ہیں جنہوں نے ایک سو تیس سال اور بعضوں نے اس سے بھی کچھ زیادہ زندگیاں پائی ہیں۔

اور دیکھیے! اگر آپ منطقی طور پر سوچیں گے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص ایک دن کی زندگی بچانے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے، وہ حفاظت حیات کے سلسلے کو کئی ہزار سال تک بھی طول دے سکتا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ اسے خرق عادت قرار دیں گے۔ اچھا یہی سہی، تو کیا انبیاء و اولیاء کے معاملات میں خرق عادت کوئی عجیب وغریب بات ہے؟

مجلہ المقتطف کے پرانے شمارے اٹھا کر دیکھیے! اس موضوع پر علمائے مغرب کے مقالے بھرے پڑے ہیں جن میں انہوں نے سائنٹفک طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان دنیا میں حیات جاوداں حاصل کر سکتا ہے اور بعض مغربی مفکر کہتے ہیں: اگر ابن ملجم کی تلوار نہ ہوتی تو علی بن ابی طالب (علیہ السلام) حیات ابدی کے مالک تھے۔ کیونکہ کمال و اعتدال کی جملہ صفتیں آپؑ کی ذات میں جمع تھیں۔ اس مبحث میں بہت کچھ شامل کیا جا سکتا ہے مگر زیادہ گنجائش نہیں۔

دوسرے اعتراض کے سلسلہ میں نگارش ہے کہ صاحب! کیا یہ قوم خدا کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے آگاہ ہونا چاہتی ہے؟ جملہ اسرار تکوینی و تشریعی سے واقفیت مطلوب ہے؟ اگر یہی منشا ہے تو پھر بسم اللہ، مگر اتنا ضرور غور کر لینا چاہیے کہ حجاب مصلحت میں اس کے علاوہ تو اور کوئی راز پوشیدہ نہیں۔ پارۂ سنگ نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، لیکن اس کے باوجود حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے! بتایئے کون سی حکمت مستور ہے؟ مغرب کی نماز تین رکعتوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ عشاء کی چار رکعتیں پڑھنا پڑتی ہیں۔ صبح کو دو ہی رکعت میں فرض پورا ہو جاتا ہے۔ کہیے اس میں کیا مصلحت

---

[1] امالی المرتضی ۱: ۲۳۲، ۲۷۲۔ [2] اکمال الدین: ۵۵۵، ۵۷۵

Marfat.com

ہے؟ نیز یقین مانیے بہت سے ایسے امور بھی ہیں جن کا علم نہ کسی ملک مقرب کو ہے اور نہ نبی مرسل کو۔ مثلاً علم الساعۃ۔ باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ‌ ۚ وَيُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ [1]

اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی مینہ برساتا ہے۔

علاوہ ازیں اور باتیں بھی ہیں جو پردہ اخفا میں رکھی گئی ہیں اور مصلحت نامعلوم! مثال کے طور پر اسم اعظم، شب قدر، ساعت استجابت دعاء وغیرہ وغیرہ۔

اس تمہید سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ باری تعالیٰ کے ان احکام و افعال کے سلسلے میں جن کی حکمت غیر ظاہر ہو، حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا وہ حکم یا فعل وجود رکھتا ہے یا نہیں؟ اب اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اوصیائے معصومین علیہ السلام کے اقوال صحیحہ سے یہ ثابت ہے تو بس! ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ حکمت و سبب کے بارے میں بحث کرنا ہم پر لازم نہیں ہے۔

امکانی طور ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مختصر سے رسالے میں دلائل و براہین کا انبار نہ لگنے پائے۔ کیونکہ سیر حاصل بحث کے لیے بڑی بڑی کتب موجود ہیں اور قائم آل محمد (ع) کے متعلق فریقین کے علمی خزانوں میں مستند احادیث کا کافی ذخیرہ محفوظ موجود ہے جن سے مستفیض ہوا جا سکتا ہے۔

مصالح غیبت کے سلسلے میں اگرچہ کہ ہم اس حقیقت کے معترف ہیں کہ خدا اپنی حکمت خود بہتر جانتا ہے، پھر بھی استفسار کرنے والے بعض شیعہ حضرات کے جواب میں بہت سے معقول وجوہ پیش کی جا چکی ہیں، جن کے اعادے کی یہاں وسعت نہیں نیز اس ضمن میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں امام کا ہونا ضروری ہے۔ دنیا حجت سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اس کا وجود بھی لطف ہے اور تصرف بھی لطف۔ لہٰذا مصلحت کا سوال ساقط اور غیبت کا اقرار لازم!

عدل

خداوند عالم کسی پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جسے عقل

---

[1] لقمان: ۳۴

Marfat.com

سلیم برا سمجھے۔ اس اعتقاد کا نام ہے عدل۔

عدل، باری تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے جس کا وجود جامعیت صفات کمال و جمال الٰہیہ کے لیے ضروری اور شان توحید کے واسطے لازم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اشاعرہ نے اس مسئلہ میں امامیہ اور معتزلہ کی مخالفت کی (امامیہ اور معتزلہ کو عدلیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اور وجہ مخالفت یہ تھی کہ اشاعرہ حسن و قبح کے عقلی ہونے کے منکر ہو کر یہ کہنے لگے کہ حسن (اچھی) وہ شے ہے جسے شریعت حسن کہے اور قبیح (بری) وہ چیز ہے جسے شرع قبیح قرار دے۔

یہاں تک کہ انہوں نے معرفت صانع اور پیغمبروں کی پہچان کے لیے معجزات کی جانچ پڑتال کو بھی سمع و شرع کے طریقوں پر محمول کیا نیز حکم خرد کو بالکل ساقط کر دیا۔ نتیجتاً وہ دور اور استحالے کے چکر میں پڑ گئے۔

لیکن عدلیہ یعنی امامیہ اور معتزلہ اس عقیدے پر قائم رہے کہ ان نظریات میں فیصلہ عقل کے ہاتھ ہے، شریعت کو کوئی دخل نہیں۔ البتہ شرعی احکام سے تاکید اور ہدایت ہوتی ہے۔ عقل بعض افعال کو اچھا سمجھتی ہے اور بعض کو برا اور اسی عقل کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ فعل قبیح ذات باری کے لیے محال ہے، کیونکہ وہ حکیم ہے اور فعل قبیح، منافی حکمت۔ فرمانبردار کو مبتلائے عذاب کرنا ظلم ہے اور ظلم، فعل قبیح ہے جو پروردگار عالم سے سرزد نہیں ہوسکتا۔

نظر بر ایں امامیہ فرقہ نے مسئلہ عدل پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی نیز خداوند عالم کی اس صفت کو اصول دین میں شامل کر لیا۔ ہاں! یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اشاعرہ خود بھی عدل کے منکر نہیں ہیں۔ البتہ اس ضمن میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایزد متعال خواہ کچھ کرے بہرحال عدل وخوبی میں فرق نہیں آ سکتا۔ ہ خیال کرتے ہیں کہ بھلا عقل کی کیا ہستی جو یہ فیصلہ کرے کہ خدا کے لیے یہ مناسب تھا اور یہ نامناسب۔

لیکن امامیہ اس حقیقت کو ثابت کرتے چلے آ رہے ہیں کہ ہر چیز کی اچھائی برائی پرکھنے کا صحیح معیار عقل ہے۔ اسی کے ذریعے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذات باری کو ہر خوبی سے متصف اور ہر بدی سے منزہ ہونا چاہیے۔ اسی نظریہ ''حسن و قبح عقلی'' کی اساس پر علم کلام کے اور بھی قواعد مرتب ہوئے۔ مثلاً قاعدہ ''لطف و وجوب شکر منعم''

Marfat.com

اور معجزے میں ''وجوب نظر'' نیز مسئلہ ''جبر و اختیار'' کی بنیاد بھی یہی ہے۔ ''جبر و اختیار'' ان غیر معمولی مسائل میں سے ہے جن پر ایک زمانے تک بحث ہوتی رہی۔ اشاعرہ جبر کے قائل تھے اور معتزلہ و امامیہ کا خیال تھا کہ ہر انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ اپنے ارادے سے سب کچھ کر سکتا ہے اور اپنی مشیت سے اپنے اعمال بجالاتا ہے۔

نفس وجود کی طرح ملکہ اختیار بھی اللہ کی دین ہے۔ خالق کائنات نے بندوں کو پیدا کیا اور انہیں اختیارات دے دیے۔ البتہ اختیار عام یا اختیار کلی خدا ہی کو حاصل ہے۔ لیکن جزئیات میں ہم بالکل آزاد ہیں۔ پروردگار عالم نہ کسی انسان کو کسی کام کے واسطے مجبور کرتا ہے اور نہ اس کے ترک کے لیے، بلکہ فرزندان آدم خود ہی من مانی کرتے ہیں۔

اسی بنا پر عقل اور عقل مندوں نے ان کی مدح و ذم کو جائز سمجھا ہے اور سزا و جزا کو درست۔ اگر کسی نے کوئی نیک کام کیا ہے تو یقیناً اس کی تعریف کی جائے گی، لیکن غلط کاروں کو قرار واقعی سزا سے کیونکر چھٹکارا مل سکتا ہے؟ پھر اگر ہم اس قاعدے کو نہ مانیں تو ثواب و عقاب کا نظریہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔ بعثت انبیاء و نزول کتب بے سود اور وعدہ و وعید لا حاصل۔

ان صفحات میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں۔ اس مسئلے پر ہم اپنی کتاب الدین والاسلام کے حصہ اول میں کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں مذہب امامیہ کا عقیدہ یہ ہے:

اللہ عادل ہے اور انسان آزاد، خود مختار!

معاد

عام مسلمانوں کی طرح شیعوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ پیدا کرنے والا سزا و جزا اور حساب و کتاب کے لیے قیامت کے دن تمام مخلوق کو زندہ محشور کرے گا۔

معاد کے معنی یہ ہیں:

ہر شخص بذات خود بعینہ اپنے جسم و روح کے ساتھ میدان حشر میں اس طرح حاضر ہوگا کہ پہچاننے والا دیکھ کر کہدے، ہاں یہ فلاں آدمی ہے!

Marfat.com

اس سلسلے میں یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ واپسی کس انداز سے ہوگی۔ اعادہ معدوم کے طور پر؟ ظہور موجود کے قبیل سے؟ یا کوئی اور طریقہ ہوگا؟

نیز حشر ونشر کے ضمن میں کتاب خدا اور احادیث صحیحہ میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے، وہ سب جزو ایمان ہے۔ جیسے عقیدۂ دوزخ و بہشت، برزخ کی آسائش اور عذاب، میزان، صراط، اعراف اور وہ اعمال نامہ جو زندگی کا مرقع ہوگا۔ علاوہ ازیں شیعہ اس کے بھی معترف ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے سزا و جزا کا مستحق ہوگا۔ نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدی:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ[1]

جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کے سامنے آئے گی اور جس نے ایک ذرہ برابر بھی برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھنا پڑے گی۔

☆☆☆☆☆

---

[1] الزلزال: ۷۔۸

Marfat.com

نظام عمل

ابتدائیہ

امامیہ شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ شریعت اسلامی کی رو سے زندگی کے جملہ معاملات میں پروردگار عالم کا کوئی نہ کوئی فرمان موجود ہے۔ قانون الٰہی نے معمولی سی خراش کی دیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ غرض کسی مکلف کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں ملے گا جو مندرجہ ذیل احکام میں سے کسی حکم کے دائرے میں نہ ہو:

۱۔ واجب ۲۔ حرام ۳۔ مستحب ۴۔ مکروہ ۵۔ مباح

لین دین ہو یا قول وقرار، شرع ضرور بتائے گی کہ یہ درست ہے یا نادرست!

سرچشمہ

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات با برکات احکام الٰہیہ کا سرچشمہ ہے۔ باری تعالیٰ نے وحی والہام کے ذریعے یہ احکام سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ودیعت فرمائے۔ آپؐ نے حسب تقاضائے حال لوگوں کو واقف کرایا اور خاص طور سے ان اصحاب کو جو ہمہ وقت حاضر بارگاہ رہتے تھے، تاکہ بمصداق آیۂ مبارکہ:

لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا[1]

تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول (ص) تم پر گواہ ہوں۔

وہ پوری دنیا میں تبلیغ کرتے رہیں۔

مگر بہت سے حکم ایسے بھی تھے جن کی تعلیم نہیں دی جاسکی۔ خواہ اس وجہ سے کہ ان کے لیے موقع نہ تھا یا اس لیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ان ضوابط کی ضرورت نہیں پڑی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر عام نہ کیے گئے ہوں۔

---

[1] البقرۃ: ۱۴۳

Marfat.com

اسی لیے کچھ احکام مشہور ہو گئے اور کچھ مستور رہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پوشیدہ احکام کو اپنے اوصیا کے سپرد فرما دیا۔ بعد ازاں ہر وصی اپنے جانشین کو بتاتا رہا کہ حسب اقتضائے زمانہ اور مناسبت وقت ان کی اشاعت ہوتی رہے۔

اختلاف

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طرح اور جس قدر مناسب سمجھا بیان فرمایا اور صحابہ نے بھی اپنی اپنی فہم کے مطابق جو سمجھ میں آیا وہ سمجھا۔ ابر رحمت تو کھل کر برسا، مگر فیض حاصل کرنے والوں کا اپنا اپنا ظرف۔ پھر سب کی ذہنی توانائیاں یکساں بھی تو نہیں ہوتیں ؎

من وطوبیٰ وسرو وقامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا [1]

اسی نے آسمان سے پانی برسایا پھر اپنے اپنے انداز سے نالے بہ نکلے۔

ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابی کسی معاملہ میں مثبت حکم پاتا ہے اور دوسرے اسی سے ملتے جلتے واقعہ میں منفی حکم سنتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فعل ایک اور احکام دو۔ یہ کتنا صریحی اختلاف ہوا؟ اچھا! اب اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟ بات یہ ہو گی کہ ان دونوں مواقع میں سے کسی ایک میں کوئی قرینہ ہو گا، کوئی خاص پہلو ہو گا۔ نقل کرنے والے یا تو اس قرینہ اور تخصیص کی طرف متوجہ نہیں ہوئے یا توجہ تو کی مگر خصوصیت اور قرینہ کا ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا احادیث میں ظاہری فرق تو نظر آ سکتا ہے لیکن واقعی اختلاف کا شائبہ تک نہیں۔

اجتہاد

اسی قبیل کے مختلف اسباب پیدا ہوئے جس کی وجہ سے صحیح حکم شناسی میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ بنا بریں اور تو اور خود وہ اصحاب جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کا شرف حاصل تھا، اجتہاد کا سہارا لینے لگے۔ چنانچہ احادیث کے کہنے اور پرکھنے

---

[1] الرعد: ١٧

Marfat.com

کا خیال دامن گیر ہوا۔ قرائن کی چھان بین ہونے لگی۔ کیونکہ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا کہ حدیث کا ظاہری مطلب کچھ ہوتا ہے اور شارع کا مقصد و منشاء کچھ اور ہوتا ہے۔ قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس تفاوت کے اسباب میں نقل کی خامی یا ناقلوں کی کوتاہی کو بڑا دخل ہے۔

مجتہد

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ اصحاب جو صاحب الرائے اور اہل روایت تھے، انہوں نے بھی کبھی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کو بعینہ ان ہی الفاظ میں دہرا دیا جن لفظوں میں سنا تھا اور گاہے نفس حدیث کی جگہ وہ حکم بیان کر دیا جو متعلقہ حدیث سے اخذ کیا تھا۔

پہلی صورت میں ان کی حیثیت راوی اور محدث کی ہوتی ہے اور دوسری شکل میں وہ مفتی اور صاحب رائے کی شان رکھتے ہیں۔ جن میں یہ ملکہ ہو انہیں مجتہد کہا جاتا ہے۔

مقلد

اور وہ عام مسلمان جو اس مرتبہ پر فائز نہ ہوں اور مجتہد کی رائے پر عمل پیرا ہوں، انہیں مقلد کا نام دیا جاتا ہے۔

الحاصل اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے ہی میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور خود آپؐ کے اصحاب اس پر عامل تھے۔ البتہ اس عہد میں اجتہاد اتنا توانا نہیں تھا جتنا اب ہے۔ کیونکہ لوگ براہ راست پوچھ سکتے تھے۔ قرائن وافر تھے۔ علم قطعی حاصل کرنے کے تمام ذرائع موجود تھے۔

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، نبوت سے دوری ہوتی گئی۔ عربوں اور عجموں میں میل جول بڑھا۔ عربی زبان کے صحیح مطلب سمجھنے میں دقتیں ہونے لگیں۔ احادیث و روایات کی بہتات ہوئی جن میں بہت سی مشکوک اور موضوع روایات بھی تھیں۔ کثرت سے جھوٹے اقوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب ہونے لگے۔ اس منزل پر

Marfat.com

احکام شریعت کا پرکھنا آسان کام نہ تھا۔ نظر براین اجتہاد نے قوت حاصل کی۔ استنباطی طریقوں میں زور آیا۔ صحیح و سقیم میں امتیاز ہوا اصول ترجیح سے کام لیا گیا۔ بہرکیف ضرورتیں بڑھتی گئیں، مجتہد کاوش فرماتے رہے اور دامن استنباط پھیلتا گیا۔

امامیہ فرقہ کے ہاں اب تک یہ نعمت موجود ہے۔ دیکھیے! ہمارا آپ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ تمام انسان دوگرہوں میں بٹے ہوئے ہیں: باسواد، بے سواد (خواندہ و ناخواندہ) نیز قدرتی طور پر بے سواد جماعت کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے باسواد طبقہ کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے۔

اسی طرح شریعت کی دنیا میں بھی دو فریق ہیں: عالم مجتہد اور جاہل مقلد۔ قاعدے کے لحاظ سے دوسرے طبقے کو مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے پہلے طبقے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

عام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ احکام شرع کا دار و مدار کتاب و سنت اور اس کے بعد عقل اور اجماع پر ہے۔ البتہ امامیہ فرقہ حسب ذیل راستوں میں دوسروں کا ساتھ نہیں دے سکتا:

۱۔ قیاس: شیعہ کبھی قیاس پر عمل نہیں کریں گے۔ کیونکہ تواتر کے ساتھ ان کے ائمہ علیہم السلام نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ الشَّرِیْعَۃَ اِذَا قیست مُحِقَ الدِّیْنُ [۱]

اگر شرعی معاملات میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں تو دین کا نقشہ بگڑ جائے گا۔

عمل بالقیاس کی خرابیوں کو ہم واضح کرتے، مگر موقع نہیں۔

۲۔ روایت غیر معتبر: یعنی اگر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل بیت اطہار علیہم السلام کی وساطت سے ملے گی تو لائق اعتبار ورنہ ناقابل تسلیم! غیر معتبر!

ابوہریرہ، سمرہ بن جندب، مروان بن حکم، عمران بن حطان خارجی اور عمرو بن عاص وغیرہم کی روایات کی ہمارے ہاں کوئی وقعت نہیں اور شیعوں ہی پر کیا منحصر، خود علمائے اہل سنت نے بھی ان راویوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ خوب پول کھولے ہیں۔

---

[۱] اصول الکافی ج ۱ کتاب فضل العلم، باب البدع والرای والمقائیس۔

Marfat.com

۳۔عدم تقلید: ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ شیعوں کے ہاں اجتہاد کا دروازہ آج تک کھلا ہوا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔ بر خلاف اس کے سواد اعظم میں ابواب استنباط مقفل ہیں۔ یہ عمل کب اور کس دلیل سے ہوا؟ اس سلسلہ میں غالباً خود ان کے علماء بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں رکھتے۔

ان امور کے علاوہ باقی سمجھنے اور استنباط میں اختلاف ہے یا فروعی اختلافات ہیں۔

منصب اجتہاد

دلائل و براہین میں رچ کر جو شخص احکام شرعیہ کے اخذ و استنباط کی قوت حاصل کرے اسے منصب اجتہاد پر فائز سمجھنا چاہیے۔

مگر صحت تقلید کے لیے اس کے علاوہ بھی کچھ شرطیں ہیں۔ سب سے اہم شرط عدالت ہے۔ عدالت سے مراد وہ باطنی جوہر ہے جس کے ہونے سے انسان اپنی پوری زندگی میں معصیت سے بچنے اور تمام واجبات کی انجام دہی پر قدرت حاصل کر سکتا ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ خوف خدا کی وہ کیفیت جو ہر حال میں دل و دماغ پر طاری رہے۔ اس کے کئی درجے ہیں۔ سب سے بڑا درجہ عصمت ہے۔ جسے امامت کی شرط قرار دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ضروریات (وہ امور جن کا تعلق علم قطعی سے ہے) میں نہ تقلید ہے، نہ اجتہاد۔ جیسے وجوب صوم و صلوٰۃ وغیرہ۔ اسی طرح اصول دین بھی تقلید و اجتہاد کی حدود سے باہر ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق ہر مکلف کے شخصی علم و تحقیق سے ہے اور جن حقائق کی واقفیت ہر شخص کی اپنی سمجھ بوجھ اور ذاتی دانش و آگہی پر منحصر ہو، انہیں دوسروں کی رائے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

ان کے سوا باقی جتنے بھی فروعی مسائل ہیں، وہ سب اجتہاد و تقلید کے دائرہ میں ہیں۔

نیز مکلفوں کے اعمال ہی احکام شریعت کا موضوع ہیں۔ لہٰذا ان کا جاننا ضروری ہے اور جاننے کے بس دو ہی طریقے ہیں: تقلید یا اجتہاد۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان طریقوں میں سے اگر کسی طریقہ سے معرفت حاصل نہ کی تو قیامت کے دن سزا بھگتنا پڑے گی۔

Marfat.com

اعمال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا:

الف۔ کچھ عمل تو خدا اور بندے سے متعلق ہیں۔ یہ عبادات کہلاتے ہیں۔ ان کی صحت خدا سے نزدیک ہونے کی نیت پر موقوف ہے۔ (قربةً اِلی اللّٰہ) عبادات یا تو جسمانی ہوتی ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج یا مالی جیسے خمس و زکوٰۃ و کفارات۔

ب۔ اور کچھ اعمال فرد اور سماج سے متعلق ہیں۔ ان کی بھی دو صورتیں ہیں: دو فریقوں سے وابستہ، مثلاً لین دین، شادی بیاہ ایک ہی فریق سے مختص جیسے طلاق اور عتق وغیرہ۔

ج۔ نیز بعض عمل بالکل شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں۔ جیسے کھانا پینا، پہننا، اوڑھنا، وغیرہ۔

فقہ

ان تمام اعمال کے جملہ احکام سے فقہ چار ابواب میں بحث کرتی ہے:

☆ عبادات ☆ معاملات ☆ ایقاعات ☆ احکام

اہم ترین عبادات چھ ہیں:

دو نری جسمانی، یعنی نماز اور روزہ۔

دو خالص مالی، یہ ہیں خمس و زکوٰۃ۔

اور دو ملی جلی، مالی اور جسمانی، جنہیں حج و جہاد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری ہے:

جَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ [1]

تم اپنی جان و مال دونوں سے جہاد کرو!

اور کفارات، چند خاص جرائم اور کوتاہیوں کی مخصوص سزائیں ہیں۔

نماز

تمام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی نماز کو دین کا ستون سمجھتے ہیں۔ یہ عبادت

---

[1] التوبۃ: ۴۱

Marfat.com

بندے کو خدا سے نزدیک کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ عمل اگر کہیں چھوٹ جائے تو عبد و معبود کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے۔ اسی لیے اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک دو نمازوں کا چھوڑنا ہی کفر و اسلام کا درمیانی فرق ہے۔

شریعت کی رو سے نماز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی عبادت بھی اس کے مقابل نہیں اور بالاتفاق فرقہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ تارک صلوٰۃ فاسق ہے۔ اسلامی معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ نہ وہ قابل اعتبار ہے، نہ لائق اعتماد نیز اس کی غیبت بھی جائز ہے۔ نماز کے سلسلہ میں بڑے سخت احکام ہیں۔

اصولاً پانچ قسم کی نمازیں واجب ہیں۔

۱۔ فرائض پنجگانہ　　　　۲۔ نماز جمعہ

۳۔ نماز عیدین　　　　۴۔ نماز آیات

۵۔ نماز طواف۔

لیکن بعض وقت خود مکلف کسی وجہ سے اپنے اوپر نماز واجب کر لیتا ہے۔ مثلاً نذر مان کر، قسم کھا کر یا کسی کی قضا نمازیں پڑھنے کی اجرت لے کر۔ ان کے علاوہ باقی سب نوافل ہیں۔

ہمارے ہاں نوافل میں سب سے اہم روزانہ نمازوں کے نافلہ ہیں جو شمار میں واجب نمازوں سے دگنے ہیں۔

روزانہ کے فرائض و نوافل کی مجموعی تعداد اکیاون رکعت ہے۔

ایک واقعہ: یہاں ہمیں ایک پر لطف واقعہ یاد آ گیا۔ راغب اصفہانی اپنی وقیع تصنیف المحاضرات میں لکھتے ہیں:

> احمد بن عبد العزیز کے زمانے کی بات ہے۔ اصفہان میں کنانی نامی ایک شخص تھا جس سے احمد پیش نمازی کے آداب سیکھتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن احمد کی ماں نے جھانک کر دیکھا اور دیکھتے ہی کنانی سے کہنے لگی: استاد محترم! آپ نے تو میرے لڑکے کو رافضی بنا دیا۔ کنانی نے برجستہ جواب دیا: معظمہ! رافضی تو روزانہ اکیاون اکیاون رکعات پڑھتے ہیں اور آپ کا لڑکا اکیاون دن میں ایک رکعت

Marfat.com

بھی نہیں ادا کرتا۔ یہ رافضی کیسے ہوسکتا ہے؟[1]

آمدم بر سر مطلب: اچھا! ان نمازوں کے علاوہ ماہ رمضان کے نوافل کو بڑی عظمت و اہمیت حاصل ہے جن کی تعداد ایک ہزار رکعات ہے۔ ہمارے سنی بھائی بھی یہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ مگر جماعت کے ساتھ، جو ان کے ہاں تراویح کے نام سے مشہور ہیں اور شیعی نقطہ نظر سے ان نمازوں میں جماعت مشروع نہیں، کیونکہ کلیہ یہ ہے کہ جماعت صرف واجب نمازیں ادا کرنے کے لیے ہے۔

تفصیلات کے لیے ہماری فقہ کی وہ ہزاروں مجلدات دیکھی جاسکتی ہیں جو علمی دنیا میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان میں کمال شرح و بسط کے ساتھ نماز کے تمام متعلقہ احکام، آداب، اذکار اور اوراد و ادعیہ وغیرہ درج ہیں۔

فقہی طور پر ہمارے ہاں صحیح نماز کی حقیقت کے ثبوت کا دار و مدار ان تین امور پر ہے:

۱۔ شرائط نماز

وہ اضافی قدریں جو چند بیرونی حقائق سے ماخوذ ہیں، اگرچہ ان میں سے کوئی بھی نفس نماز میں داخل نہیں، لیکن سب ایسی بندھی ٹکی صفتیں ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز بالکل باطل ہو جاتی ہے۔ ان کی تعداد چھ ہے:

۱۔ طہارت ۲۔ وقت ۳۔ قبلہ ۴۔ ساتر ۵۔ نیت ۶۔ مقام

نماز کی جگہ کو اگرچہ رکن کی حیثیت حاصل نہیں، لیکن اس کا مباح ہونا ضروری ہے نیز اسی طرح جائے سجدہ کی پاکیزگی بھی لازم ہے۔

۲۔ اجزائے وجودی

وہ عناصر جن سے نماز کی صورت گری ہوتی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ رکنی ۲۔ غیر رکنی

رکنی: جن کے بغیر نماز مطلق طور پر باطل ہو جاتی ہے، یہ پانچ ہیں:

۱۔ نیت ۲۔ تکبیرۃ الاحرام ۳۔ قیام ۴۔ رکوع ۵۔ سجود۔

غیر رکنی یہ ہیں:

---

[1] محاضرات الادباء ۴: ۴۴۸-۴۴۹۔

Marfat.com

قرائت، ذکر، تشہد، سلام۔

ترتیب، موالات اور طمانیت ان سب میں ضروری ہے۔

اذان اور اقامت مستحب مؤکد ہیں، بلکہ اقامت کا وجوب قوت سے خالی نہیں۔

۳۔ مبطلات

وہ امور جن کے ہوتے ہوئے نماز باطل ہو جاتی ہے، یہ بھی دو قسم کے ہیں:

۱۔ رکنی: مطلقاً باطل کر دینے والے۔ یہ تعداد میں تین ہیں: حدث، استدبار، عمل کثیر۔

۲۔ غیر رکنی: جنہیں قصداً اختیار کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

بولنا، آواز سے ہنسنا اور اسی طرح رونا، دائیں بائیں دیکھنا، کھانا، پینا۔

طہارت سے مراد وضو اور غسل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے واجب ہونے کے کچھ اسباب ہیں۔ لیکن پانی کی نامیسری یا کسی اور مجبوری جیسے بیماری، زیادہ سردی، تنگی وقت وغیرہ کے باعث اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پھر ان کا بدل تیمم ہے۔

فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا[1]

(اور پانی نہ ملے) تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔

فقہاء اور ارباب لغت نے صعید کے معنوں میں اختلاف کیا ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ اس سے مقصود صرف مٹی ہے۔ بعض کے خیال میں بغیر کسی قید و شرط کے رُوئے زمین مراد ہے، جس میں ریت، سنگریزے، پتھر اور غیر سوختہ معدنی اشیاء وغیرہ سب شامل ہیں، جن پر سجدہ کرنا جائز ہے اور یہ زیادہ صحیح ہے۔

نماز کے بارے میں یہ مختصر سی گفتگو تھی۔ اس سلسلے میں بڑے زبردست اور طویل مباحث ہیں جن کے لیے جلدیں کی جلدیں درکار ہیں۔

روزہ

امامیہ عقیدے کے مطابق روزہ شریعت اسلامیہ کا ایک رکن ہے۔ احکام کے

---

[1] النساء: ۴۳ ۔ المائدۃ: ۶

Marfat.com

لحاظ سے صیام کی چار قسمیں ہیں۔ واجب، مستحب، حرام، مکروہ۔ واجب روزے دو قسم کے ہوتے ہیں:

ا۔ شرع کے واجب کردہ۔ یہ ہیں ماہ رمضان کے روزے۔

۲۔ جو کسی سبب سے واجب ہوگئے ہوں۔ جیسے صوم کفارہ، بدل ھدی، نیابت اور نذر وغیرہ کے روزے۔

رجب و شعبان کے روزے مستحب ہیں نیز ان کے علاوہ اور بہت سے سنتی روزے ہیں۔

عیدین اور ایام تشریق کے روزے حرام ہیں نیز یوم عاشور اور عرفہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

صیام کی کچھ شرائط ہیں، واجبات و مبطلات ہیں اور آداب و اذکار ہیں۔ اس موضوع پر بھی ہزاروں کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔

رمضان المبارک کے روزوں کا شیعہ اس قدر التزام کرتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ بہت سے لوگ تو مرض موت اور جان لیوا پیاس میں بھی اس عبادت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

نماز اور روزہ خالص جسمانی عبادات ہیں۔

زکوٰۃ

شیعوں کے نزدیک نماز کے بعد زکوٰۃ کا مرتبہ ہے، بلکہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی بعض احادیث میں یہ مضمون ملتا ہے: جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز ہی درست نہیں۔

عام مسلمانوں کی طرح امامیہ حضرات بھی نو چیزوں پر زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں:

مویشی: اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری۔

غلے: گیہوں، جو، خرما، مویز (منقّٰی)

نقدی: طلائی اور نقرئی سکے۔

ان کے علاوہ تجارتی سامان، گھوڑوں نیز زمین سے پیدا ہونے والی تمام اشیاء جیسے دالوں اور ترکاریوں وغیرہ کی زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے۔

Marfat.com

وجوب واستحباب کی کچھ شرائط وضوابط ہیں جو اپنے اپنے مقام پر مذکور ہیں۔ اس سلسلے میں بیشتر قواعد مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے مطابق ہیں۔ زکوٰۃ کے مستحق حسب ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ[1] فقراء و مساکین ہی ہیں۔

زکوٰۃ فطرہ

فطرہ ہر اس بالغ و عاقل غنی شخص پر واجب ہے جو خود مکلفی نیز اپنے اہل وعیال اور دوسرے تمام متعلقین کا معاشی بار اُٹھانے کی سکت رکھتا ہو۔ چاہے آزاد ہو یا مملوک غلام۔ اس کی مقدار ہر فرد کی جانب سے گیہوں، جو یا کھجوروں کا ایک صاع ہے۔

یہاں بھی شیعی مسائل سنیوں سے مختلف نہیں ہیں۔

خمس

خمس سات چیزوں پر واجب ہوتا ہے:

۱۔ دارالحرب کا مال غنیمت۔

۲۔ غواصی (غوطہ زنی) سے حاصل شدہ جواہر و معاون نباتات۔

۳۔ پوشیدہ خزانے۔

۴۔ معدنی اشیاء، حرام سے مخلوط شدہ حلال مال۔

۵۔ کاروبار کی منفعت۔

۶۔ مسلم سے ذمی کو منتقل شدہ اراضی۔

خمس کی اصل و اساس پروردگار عالم کا یہ اشارہ:

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡيَتٰمٰی وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ...[2]

آگاہ ہو کہ جو اموال بطور غنیمت تمہیں دستیاب ہوں ان کا پانچواں حصہ خدا، رسول، ذی القربیٰ، ایتام، مساکین اور پردیسیوں کا ہے۔

---

[1] التوبۃ: ۶۰　[2] الانفال: ۴۱

Marfat.com

اس ضمن میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خمس وہ حق ہے جسے خداوند کریم نے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مختص فرمایا ہے۔ کیونکہ نبی زادوں پر صدقہ حرام ہے، لہٰذا وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتے، ان کے لیے پروردگار عالم کی یہ عنایت اسی کا نعم البدل ہے۔

خمس کے چھ حصے ہوتے ہیں۔ تین: اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ذی القربیٰ کے، جنہیں موجودگی کی صورت میں امام علیہ السلام کی خدمت اقدس میں پیش کرنا واجب ہے اور غیبت میں یہ نائب امام یعنی مجتہد عادل کے حوالے کرنا ہوں گے، تاکہ ان محاصل سے وہ دین مبین کی حفاظت، ضعیف، نادار و مساکین کی امداد اور ملت غرا کے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل فرما سکیں۔ یہ ہے اس کا حقیقی مصرف نہ کہ وہ جسے سید محمود آلوسی کی ذہنی بدعت کہنا چاہیے۔

سید صاحب مذکور اپنی تفسیر میں ایک جگہ پر مزاحاً تحریر فرماتے ہیں:

اس زمانے میں تو ایسے حقوق کو سرداب میں رکھ دینا چاہیے۔[1]

یہ دراصل اشارہ ہے اس غلط افسانے کی طرف جو ان کے باپ دادا سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس قوم کے ہر چھوٹے بڑے سے سن لیجیے: شیعہ کہتے ہیں ان کے امام سرداب میں غائب ہوگئے۔ حالانکہ سرداب کا غیبت سے کوئی ربط ہی نہیں۔ اثناعشری حضرات تو اس لیے سامرہ کے تہ خانے کی زیارت کو جاتے ہیں کہ یہ امام ہمام کے تہجد کی جگہ تھی نیز حضور (ع) کے پدر بزرگوار اور جد عالی تبار بھی اسی مقام پر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

خمس کے باقی تین حصص ہاشمی محتاجوں کا حق ہیں جن پر زکوٰۃ حرام ہے۔

یہ تھے امامیہ مذہب کے احکام خمس، جو عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر اب تک نافذ العمل ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے آل ہاشم علیہم السلام کا حق چھین کر بیت المال میں جمع کر دیا۔ یہ گھرانا زکوٰۃ تو لے ہی نہیں سکتا تھا، خمس سے بھی محروم ہوگیا۔

غالباً امام شافعی نے اپنی کتاب الام کے صفحہ ۶۹ پر اس جانب اشارہ کیا ہے کہ آل محمدؐ، جن کے لیے صدقہ کی جگہ خمس مقرر ہوا تھا، نہ انہیں مقررہ صدقات میں سے کچھ

---

[1] روح المعانی ۱۰:۵

Marfat.com

مل سکتا ہے اور نہ وہ لے سکتے ہیں نیز اگر دینے والا جاننے کے باوجود دے بھی دے تو اسے ثواب سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں:

> اگر حق خمس سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ صدقہ وغیرہ جو ان کے لیے حرام ہے، وہ اس جہت سے حلال ہو جائے گا۔

ہاں! چونکہ مہربانوں نے حق ہی ساقط کر دیا، اس لیے سواد اعظم کے فقہی مجموعوں میں سرے سے یہ موضوع ہی ناپید ہے اور انتہا یہ کہ خود امام شافعی کی کتاب بھی اس مبحث سے خالی ہے۔ البتہ شیعوں کی ہر چھوٹی بڑی تصنیف میں زکوٰۃ وغیرہ کی طرح خمس کو بھی ایک مستقل عنوان کی حیثیت حاصل ہے۔[1]

حج

شیعہ عقائد میں حج اسلام کا بہت اہم ستون ہے۔ اس فریضہ کے ترک کرنے والے کو پاداش جرم میں یا تو یہودیوں کی طرح مرنا ہوگا یا نصاریٰ کی سی موت قبول کرنا پڑے گی۔ اس سے روگردانی کفر کی حدوں کو پہنچا دیتی ہے۔ آیۂ مبارکہ: وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ[2] کا اشارہ اسی جانب ہے۔

حج ایک قسم کا مالی اور جسمانی جہاد ہے، بلکہ حج کو جہاد معنوی اور جہاد کو حج حقیقی کہنا چاہیے۔ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان دونوں کی یگانگت سمجھ میں آ جائے گی۔

حج کی اقسام

حج کی درج ذیل تین اقسام ہیں:

---

[1] البتہ فاضل محترم حافظ ابوعبید القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۴ ھ) نے اپنے عظیم شاہکار "کتاب الاموال" کے ایک مستقل باب میں خمس کے تمام اصناف، احکام اور مصارف پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بحث کے بیشتر اجزاء شیعی مسائل سے اتفاق کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۳۰۳ تا ۳۴۹۔

[2] استطاعت کے باوجود حج سے انکار کرنے والے کو خیال ہونا چاہیے کہ اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے۔ آل عمران: ۹۷

Marfat.com

۱۔ حج افراد: حسب ارشاد:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[1]

جو لوگ پہنچنے کی قدرت رکھتے ہوں، خدا کے واسطے ان پر حج واجب ہے۔

۲۔ حج قران: جس کی اس آیت میں تصریح ہے:

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ[2]

خدا کے لیے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔

۳۔ حج تمتع: بمفاد آیہ کریمہ:

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ[3]

پس جو شخص حج تمتع کا عمرہ بجا لائے اسے جو قربانی میسر ہو، وہی پیش کر دے۔

ان میں سے ہر ایک کے بڑے بڑے مباحث اور طول طویل احکام ہیں جو فقہ کی کتب میں مذکور ہیں۔

ہم علمائے اہل سنت کی بہت سی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کے اکثر مسائل ہمارے مسائل سے میل کھاتے ہیں۔ ہاں! کہیں کہیں اختلاف ہے مگر بہت کم۔

شیعہ حج کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ادائیگی فرض کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ راہیں طے کرنا پڑتی تھیں، قدم قدم پر ان لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا جو ان کے خون کے پیاسے اور عزت و ناموس کے دشمن تھے، ان وقتوں میں بھی اس مخلص گروہ نے خطرات سے بے پرواہ ہو کر لاکھوں کی تعداد میں خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ جان و مال کے اندیشوں سے ہمتیں پست نہیں ہوئیں۔ واجبات کا احساس قدم بڑھاتا ہی رہا۔ حج کیا اور بڑی بڑی قیمتیں دے کر کیا۔

مگر افسوس اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے: شیعہ اسلام کی تخریب چاہتے ہیں۔

---

[1] آل عمران: ۹۷ [2] البقرۃ: ۱۹۶ [3] البقرۃ: ۱۹۶

Marfat.com

جہاد

جہاد اسلام کی عالی شان عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دین حق نہ دنیا کے لیے وجہ رحمت بنتا اور نہ انسانیت کے واسطے باعث برکت ثابت ہوتا۔

ظلم اور ظالموں کی مقاومت اور فتنہ وفساد کی روک تھام کے لیے جان و مال کو راہ خدا میں قربان کر دینے کا نام جہاد ہے۔

مذہب شیعہ میں اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جہاد اکبر

۲۔ جہاد اصغر

اس باطنی دشمن کا مقابلہ، جسے نفس کہتے ہیں، اس کے برے اثرات یعنی جہالت، بزدلی، جور و جفا اور رشک ونخوت وغیرہ سے برسر پیکار ہونا جہاد اکبر ہے۔ سب سے بڑا عدو، وہ نفس ہے جو تمہارے پہلو سے لگا ہوا ہے۔

جہاد اصغر سے مراد اس ظاہری دشمن کی مدافعت ہے جسے عدل و انصاف، امن وشرافت اور دین وحقیقت سے عداوت ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

واجبات شرعیہ کا اہم ترین عنوان، فرائض عقل کا سب سے بڑا موضوع، حق و حقیقت کی طرف بلانے کا مؤثر ذریعہ، کفر و باطل کو مٹانے کا کامیاب حربہ! جس قوم نے بھی اس مقدس قانون سے غفلت برتی، وہ آپ اپنے ہاتھوں برباد ہوئی، بلکہ ستم گاروں اور فریب کاروں کی جولان گاہ بن کر رہ گئی۔

اسی لیے صاحب شریعت صلوٰۃ اللہ علیہ اور ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس ضمن میں بہت تاکید فرمائی ہے۔ جگہ جگہ اس کی پابندی کے فوائد اور نظر انداز کر دینے کے پرہول عواقب سے آگاہ کیا ہے۔ آج ہم ان ارشادات کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ سامنے کی باتیں ہیں۔ عیاں را چہ بیاں!

بہرحال! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہم چھوڑ ہی بیٹھے۔ مگر کاش یہ غفلت یہیں تک رہے۔ اس منزل تک نہ پہنچنے پائے کہ معروف منکر اور

Marfat.com

منکر معروف بن جائے۔ رہبری کی رسم اٹھ گئی۔ آگے خدا حافظ ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اب تو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں خود رہنما نہ بھٹک جائیں۔ ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔[1] بحر و بر میں فساد رونما ہو گیا۔ نتیجہ تباہی اور مکمل تباہی!

خداوند عالم بے عمل ناصحوں اور بدکردار واعظوں پر لعنت بھیجتا ہے۔

شیعی مسلک میں مذکورہ عبادات امہات العبادات اساسی عبادات کہلاتی ہیں، جن کے سلسلے میں ہم نے صرف اشارے کیے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو صدر اول سے لے کر عصر حاضر تک کے علماء کی قابل قدر عظیم تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہمارے شاہکار مٹنے کے باوجود اب بھی لاکھوں مجلدات کی صورت میں فیض رساں ہیں۔

معاملات

معاملوں میں دو فریقوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک قبلوانے والا، اور دوسرا قبولنے والا۔ (ایجاب و قبول شرط لازم ہے)

معاملات کبھی تو صرف مالی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے خرید و فروخت، اجارہ و رہن، قرض و ہبہ، صلح اور اجرت وغیرہ۔

فقہ کی تمام کتب میں پوری شرح و بسط کے ساتھ ان کے جملہ متعلقات کا ذکر موجود ہے۔

معاملات کی دوسری شکل میں مال و دولت تو ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور اصل مقصد تدبیر منزل، افزائش نسل اور بنائے نوع ہوتا ہے۔ جیسے عقود زواج یعنی ازدواجی معاہدے۔ ہمارے ہاں ان معاہدوں کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ عقد دوام
۲۔ عقد منقطع

عقد دوام وہ نکاح ہے جس میں کسی وقت وغیرہ کی شرط موجود نہ ہو۔ بمفاد آیہ مبارکہ:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ[2]

---

[1] الروم: ۴۱ [2] ۲۴ نور: ۳۲

Marfat.com

اور اپنی (قوم کی) بے شوہر عورتوں اور اپنے نیک بخت غلاموں اور لونڈیوں کا بھی نکاح کر دیا کرو۔

اور عقد منقطع کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں کسی مدت کو ملحوظ رکھا جائے۔

نکاح کی پہلی قسم سے تو تمام مسلمان متفق ہیں۔

دوسری قسم کو جسے حسب فرمان خداوند کریم: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ...[1] نکاح متعہ بھی کہا جاتا ہے، سوائے شیعوں کے اور کوئی جائز نہیں سمجھتا۔ صرف شیعہ ہی اس کی مشروعیت کے قائل ہیں نیز عہد صحابہ سے لے کر اب تک یہ مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ چنانچہ معاملے کی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرتے چلیں۔

بحث متعہ

واقعہ یہ ہے کہ ہر شخص جسے ذرا بھی مذہب اسلام کو سمجھنے کا موقع ملا ہے اور جس نے بھی دینی قوانین کے مطالعہ میں زندگی کے کچھ لمحے صرف کیے ہیں، وہ اس حقیقت سے قطعاً انکار نہیں کر سکتا کہ متعہ کا مطلب وہ عقد ہے جو ایک بندھے ٹکے وقت کے لیے ہو۔ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کے عقد کو رائج کیا، مباح فرمایا اور حیات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بڑے بڑے صحابہ اس پر عمل پیرا ہوئے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہ کرام اس قانون پر عمل پیرا رہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس، جابر بن عبد اللہ انصاری، عمران بن الحصین، ابن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہم، یہ تمام اعاظم و مشاہیر متعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے اور آیت متعہ کو اس طرح پڑھتے تھے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى [2]۔

لیکن ہماری رائے میں یہ یقین کرنا درست نہ ہوگا کہ یہ حضرات اللہ کے کلام میں کسی نقص و تحریف کے قائل تھے (معاذاللہ)۔ نہیں، بلکہ غالباً سخن شناس ہونے کی وجہ سے تفسیر کے طور پر اس جزو کے ذریعہ آیت کا منشا بیان کرتے ہوں گے۔ چونکہ

---

[1] ۴ نساء: ۲۴

[2] جامع البیان للطبری ۵: ۹۔ التفسیر العظیم لابن کثیر ۱: ۴۷۴۔ تفسیر الکشاف للزمخشری ۱: ۵۱۹۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۲: ۱۴۔ السنن الکبریٰ للبیھقی ۷: ۲۰۵۔

Marfat.com

عرصہ دراز تک یہ بزرگ شمع نبوت کا طواف کرتے رہے، لہٰذا انہیں معارف قرآنی کو زبان رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سننے اور سمجھنے کا خوب موقع ملا۔

بنابریں جب لوگ ان سے دریافت کرتے ہوں گے تو اس آیت کے سلسلے میں ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کردہ مفہوم کو ظاہر کردینے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوتا ہوگا۔ حالانکہ ابن جریر نے اپنی تفسیر کبیر میں جو روایات درج کی ہیں، ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی والا ٹکڑا آیت کا حصہ ہے۔ چنانچہ موصوف ابونضرہ کی زبانی نقل کرتے ہیں:

> میں نے اس آیت کو ابن عباس کے سامنے پڑھا تو آپ نے فرمایا: اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ میں نے عرض کی: میں تو یوں نہیں پڑھتا۔ اس پر ابن عباس نے تین مرتبہ فرمایا: بخدا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔[1]

لیکن یہاں بھی ہم عرض کریں گے کہ رئیس ملت حضرت ابن عباس کا مقام ان نقائص سے بہت بلند ہے۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو غالباً رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جلیل القدر صحابی کا مقصود یہ ہوگا کہ پروردگار عالم نے اس کی تفسیر یوں نازل فرمائی ہے۔

بہرحال اجماع و یقین، متعہ کی صحت و مشروعیت کا بین ثبوت ہیں۔ اب رہا مخالف نظریہ رکھنے والوں کا دعویٰ، تو اس میں وزن ہی کیا ہے؟ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ قانون نافذ ہوکر منسوخ ہوگیا۔ حالانکہ نقل کے طریقے میں جو اختلافات نمایاں ہیں وہ قطع و یقین تو درکنار ظن و تخمین کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ دیکھیے بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ حکم قطعی کی تنسیخ کے لیے دلیل قطعی کا ہونا ضروری ہے اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ تنسیخ سنت کے طریقہ سے عمل میں آئی۔ سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مباح فرما کر حرام قرار دے دیا۔[2] بعض فرماتے ہیں کہ نہیں، کتاب خدا کے ذریعہ حرمت کے

---

[1] جامع البیان طبری ۵:۹

[2] صحیح مسلم باب نکاح المتعہ۔ مجمع الزوائد ۴:۲۶۴۔ سنن ابی داؤد ۲:۲۲۷، طبقات ابن سعد ۴:۳۴۸ سنن البیہقی ۴:۳۴۸۔ مصنف ابن ابی شیبۃ ۴:۲۹۲۔ فتح الباری ۱۱:۷۳۔ سنن دارمی ۲:۱۴۰، سنن ابن ماجہ حدیث ۱۹۶۲۔

Marfat.com

پھر بیٹھ گئے نیز اس منزل پر بھی اتحاد فکر عنقا ہے۔ کیونکہ ایک گروہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا[1] اور دوسرا آیہ مواریث ازواج[2] کو ناسخ سمجھتا ہے۔

اب ان پریشاں خیالیوں کی جو قیمت ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

بنا برایں یہاں مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ آگے چل کر قدرے توضیح کی جائے گی۔

ہاں! اور اکثر بزرگ اس آیت سے متعہ پر خط نسخ پھیرتے ہیں۔[3]: اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ -[4]

آیت میں حلیت کے دو سبب بتائے گئے ہیں:

۱۔ زوجیت ۲۔ ملکیت

چنانچہ اس موقع پر سید آلوسی رقم طراز ہیں:

شیعہ حضرات ممتوعہ کو مملوکہ (کنیز) قرار نہیں دے سکتے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے اور زوجہ کہ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس میں زوجیت کی شرائط یعنی میراث، عدہ اور نفقہ وطلاق کا فقدان ہے۔[5]

غور فرمایئے، دلیل میں کتنا زبردست مغالطہ ہے۔ اب ذرا تجزیہ کیجیے۔ پہلی چیز میراث۔ اگر زوجیت کے لیے اس شرط کو انہوں نے عمومی انداز میں پیش کیا ہے یعنی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زوجہ ورثہ پاتی ہے تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن غالباً سید صاحب کا یہ منشا نہیں اور اگر یہ مراد ہے کہ میراث لازمی اور دائمی شرط ہے، یعنی بہرصورت ورثہ ملنا چاہیے تو یہ قطعی طور پر خلاف شرع ہے۔ کیونکہ شریعت میں اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جہاں میراث ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً قاتل اور کافر زوجہ کو ورثہ نہیں ملتا۔ ایسی عورت جو

---

[1] الطلاق: ۱۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵:۱۳۰، التفسیر الکبیر للرازی ۱۰:۴۹۔ سنن البیہقی ۷:۲۰۷۔

[2] النساء: ۱۲۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵:۱۳۰۔ التفسیر الکبیر للرازی ۱۰:۵۰۔

[3] سنن الترمذی ۵:۵۰۔ سنن البیہقی ۷:۲۰۹۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵:۱۳۰۔ التفسیر الکبیر للرازی ۱۰:۵۰ المبسوط للسرخسی ۵:۱۲۵۔

[4] المومنون: ۶ و معارج: ۳۰

[5] روح المعانی ۵:۷۔

Marfat.com

کسی مریض کے عقد میں چلی جائے اور دخول سے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ بھی محروم ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اسی مرض کے عالم میں اس کا انتقال ہو جائے تو عدہ کی مدت گزارنے کے باجود دوران سال میں مطلقہ وراثت کی حقدار ہو گی۔

غرضیکہ دونوں رخ سامنے آ جائیں تو صاف ظاہر ہے کہ ارث کو لازمۂ زوجیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

رہا عدت کا لزوم تو امامیہ مذہب میں بالاتفاق ثابت ہے بلکہ جو بھی متعہ کی مشروعیت کا قائل ہے وہ عدت کو واجب قرار دیتا ہے۔

تیسری چیز نفقہ ہے۔ اسے بھی شرط زوجیت نہیں بنایا جا سکتا۔

اطمینان کے لیے زن ناشزہ کے احکام دیکھ لیجیے کہ وہ زوجیت میں ہوتی ہے مگر اس کے نفقہ کو بالاتفاق کوئی بھی واجب نہیں سمجھتا۔

باقی رہا طلاق کا معاملہ۔ تو اس سلسلے میں مدت کا بخش دینا کافی ہے۔ طلاق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

تیسری بات یہ کہ ازواج کی آیت سے متعہ کی منسوخی محال ہے۔ کیونکہ آیت متعہ سورہ نساء میں ہے، جو مدنی ہے[1] اور آیۂ ازواج سورہ مومنین و معارج میں ہے اور یہ دونوں مکی ہیں۔[2] بنابرایں نسخ ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ منسوخ پر ناسخ کا تقدم ناممکن ہے۔

چوتھے یہ کہ اکابر اہل سنت بیان فرماتے ہیں کہ آیت متعہ منسوخ نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو کشاف زمخشری ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ متعہ کی آیت ''محکمات'' میں سے ہے۔[3]

دوسروں نے روایت کی ہے کہ حکم بن عینہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آیت

---

[1] الکشف عن وجوہ القرء آت السبع ۱: ۳۷۵۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵ :۱۔ الکشاف للزمخشری ۱: ۴۹۲۔

[2] الکشف عن وجوہ القرء آت السبع ۲: ۱۲۵ و ۳۳۴۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۲: ۱۰۲ و ۱۸: ۲۷۸۔ الکشاف للزمخشری ۳: ۲۴ و ۴: ۶۵۶۔

[3] الکشاف ۱: ۵۱۹۔

Marfat.com

متعہ منسوخ ہوگئی ہے؟ جواب ملا نہیں![1]

خلاصہ یہ کہ پہلے تو جمہور اسلام نے اس کی مشروعیت کا اعتراف کیا لیکن بعد میں منسوخ ہونے کے دعوے کرنے لگے اور طریق نسخ میں جو قیاس آرائیاں فرمائی ہیں وہ بھی قابل دید وشنید ہیں۔ کبھی تو آیت کو آیت کے ذریعہ منسوخ فرمانے کی کوششیں ہوئیں (ضعف دلیل کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے) گاہے آیت کو حدیث سے ختم کرنے کی سعی فرمائی گئی۔ اس ضمن میں صحیح بخاری ومسلم کی اس روایت سے استشہاد کیا جاتا ہے کہ فتح مکہ، فتح خیبر یا غزوہ اوطاس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔[2]

اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ معاملہ آماجگاہ اختلاف بنتا ہے۔ نہ جانے کتنے رنگ چڑھتے ہیں اور کیا کیا پینترے بدلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عیاض کی زبانی بیان کیا جاتا ہے:

> بعض علماء کا ارشاد ہے کہ نکاح متعہ دو دفعہ حرام، مباح اور منسوخ ہوا۔[3]

لیکن آنکھ کھول کر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی علمی دنیا میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ بعض کتب میں لکھا ہے کہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر منسوخ کیا۔[4] دوسری مصنفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک ۹ھ میں تنسیخ ہوئی۔[5] کچھ قلمکاروں نے غزوۂ اوطاس اور غزوۂ حنین شوال ۸ھ کا حوالہ دیا ہے[6] مگر ایک اور گروہ فتح مکہ رمضان ۸ھ کا واقعہ بتاتا ہے۔[7]

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر جائز قرار دیا تھا اور پھر چند دن بعد وہیں اس کی حرمت کا حکم صادر فرمایا۔[8]

---

[1] الدرالمنثور للسیوطی ۲: ۱۴۰۔ [2] صحیح البخاری ۷: ۱۶۔ صحیح المسلم ۲: ۱۰۲۳۔ ۱۸ او ۱۰۲۷۔ ۲۹، ۳۰۔

[3] شرح صحیح مسلم للنووی ۹: ۱۸۱۔ التفسیر العظیم لابن کثیر ۱: ۴۷۴۔

[4] سنن ابی داؤد ۲: ۲۲۷۔ سنن البیہقی۔ طبقات ابن سعد ۴: ۳۴۸۔

[5] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵: ۱۳۰۔ سنن البیہقی ۷: ۲۰۷۔ مجمع الزوائد ۴: ۲۶۴۔ فتح الباری ۱۱: ۷۳

[6] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۳۔

[7] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۵۔ سنن البیہقی ۷: ۲۰۲۔ سنن الدارمی ۲: ۱۴۰۔ مجمع الزوائد ۴: ۲۶۴۔ مصنف ابن ابی شیبۃ ۴: ۲۹۲۔

[8] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۵۔ سنن البیہقی ۷: ۲۰۲۔

Marfat.com

البتہ شہرت اور غالب رائے یہ ہے کہ متعہ کی تنسیخ ۷ھ میں غزوہ یا عمرۃ القضاء کے موقع پر عمل میں آئی۔[1]

بہر کیف! اس مختصر خیال سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دو یا تین دفعہ نہیں (جیسا کہ نووی شارح مسلم نے ترقیم فرمایا ہے)[2] بلکہ پانچ چھ مرتبہ حرام حلال کا کھیل ہوتا رہا۔

کیوں؟ علمائے اسلام! بازی بازی با دین خدا ہم بازی؟ یہ کیا اندھیر ہے؟ سچ کہنا اس درجہ فکری انتشار کے ہوتے ہوئے تمہارے ادعائے نسخ میں کوئی جان باقی رہ جاتی ہے؟ یہ نا قابل انکار حقائق ہیں کہ قرآنی احکام اخبار آحاد سے منسوخ نہیں ہو سکتے۔ نسخ کی دلیلیں خود سواد اعظم کی روایات عدم نسخ سے متصادم ہوتی ہیں۔

صحیح بخاری کی روایت ہے۔ ابو رجاء عمران بن حصین ناقل ہیں:

آیہ متعہ قرآن میں موجود ہے۔ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہوتے ہوئے ہم نے اس پر عمل کیا۔ پھر نہ قرآن نے اس کی حرمت کا حکم دیا اور نہ آخر وقت تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ممانعت فرمائی۔ ہاں! ایک شخص نے من مانی کی، جو چاہا کہہ دیا۔ محمد کا قول ہے کہ اس حرکت کو حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔[3]

نیز صحیح مسلم میں عطا کے حوالے سے لکھا ہے:

ایک مرتبہ جابر بن عبد اللہ انصاری عمرہ بجا لانے کے لیے آئے تو ہم سب ان کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان سے مختلف مسائل پوچھے۔ چنانچہ متعہ کے متعلق بھی دریافت کیا۔ جابر نے کہا۔ ہاں! عہد رسالت میں ہم نے متعہ کیا اور ابوبکر و عمر کے زمانے میں بھی[4]

---

[1] سنن ابن ماجہ ۱: ۶۳۰۔ ۱۹۶۱۔ صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۷۔

[2] شرح صحیح مسلم للنووی ۹: ۱۸۰۔

[3] صحیح البخاری ۶: ۳۳۔ صحیح مسلم ۲: ۹۰۰۔ ۱۷۲۔ التفسیر الکبیر للرازی ۱۰: ۴۹۔ تفسیر البحر المحیط لابن حیان ۳: ۲۱۸۔ السنن الکبری للبیھقی ۵: ۲۰۔

[4] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۳۔ ۱۵

Marfat.com

مسلم کی ایک اور روایت ہے اور حضرت جابر ہی کی زبانی فرماتے ہیں:

دور نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عہد ابوبکر میں تو ہم ایک مٹھی کھجور اور مٹھی بھر ستو دے کر متعہ کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عمرو بن حریث کے واقعہ کے بعد عمر نے ممانعت کر دی۔[1]

علاوہ ازیں صحیح مسلم کے اوراق میں یہ بھی موجود ہے:

ابونضرہ بیان کرتے ہیں کہ میں جابر بن عبداللہ انصاری کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں ایک اور آدمی آ گیا اور آتے ہی کہنے لگا: متعوں کے بارے میں تو ابن عباس اور ابن زبیر کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے؟ جابر نے فرمایا: رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی موجودگی میں تو ہم ان پر عمل پیرا تھے۔ لیکن بعد میں عمرؓ نے ممانعت کر دی۔ اس لیے پھر نہ کر سکے[2] اور ایسا اس لیے نہ کر سکے کہ عہد عمر میں جو بھی متعہ کرتا اس کو سنگسار کر دیا جاتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کے اس حصے کو اگر غور سے دیکھا جائے تو تضاد بیانی کے ایسے ایسے عجوبے نظر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ادھر مثبت احادیث، ادھر منفی روایات۔ یہاں نسخ کے دعوے وہاں عدم نسخ کے ثبوت اور سنیئے! جھنی فرماتے ہیں:

فتح مکہ کے موقع پر خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں متعہ کا حکم دیا تھا لیکن ہم وہاں سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی ممانعت فرما دی۔[3]

تنسیخ کی نسبت کبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف، گاہے حضرت عمرؓ کی جانب۔ مزید برایں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور پہلی خلافت کے زمانے میں عقد متعہ رائج تھا اور یہ بھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے متعدد مواقع پر جناب ابن عباسؓ کو متعہ کے بارے میں گفتگو کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی رائے بدل دی۔[4] مگر اس کے ساتھ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ ابن زبیر نے ایک مرتبہ مکہ میں اٹھ کر

---

[1] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۳۔ ۱۶۔
[2] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۳۔ ۱۷۔
[3] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۵۔ ۲۲
[4] المنصف لعبدالرزاق ۷: ۵۰۱۔ الکشاف للزمخشری ۱: ۵۱۹۔

Marfat.com

کہا تھا:

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ خداوند عالم نے جس طرح ان کی بصارت چھینی، اسی طرح ان کی بصیرت بھی سلب کر لی۔ وہ متعہ کا فتویٰ دیتے پھرتے ہیں!

(یہ اشارہ ابن عباسؓ کی طرف تھا، جو نابینا ہو گئے تھے) اس پر ابن عباسؓ نے آواز لگائی:

ہاں! قسم کھا کر کہتا ہوں کہ متعہ امام المتقین (علیہ السلام) کے زمانے تک رائج تھا۔[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبد اللہ بن عباس نے کبھی بھی اپنی رائے نہیں بدلی، بلکہ وہ زندگی بھرتا دور خلافت ابن زبیر اپنے فتویٰ پر قائم رہے۔

اور سب سے زیادہ پر لطف بات تو یہ ہے کہ امتناعی حکم کو جناب امیر علیہ السلام سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔ حالانکہ عقد متعہ کو جائز قرار دینا اہل بیت علیہم السلام کا امتیازی مسلک ہے۔ پھر خصوصیت سے اس ضمن میں امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد:

اگر عمر نے لوگوں کو متعہ سے منع نہ کیا ہوتا تو گنتی کے شقی یا گئے گزرے کچھ لوگ ہی زنا کے مرتکب ہوتے۔

ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔[2]

اس سلسلے میں باوثوق ذرائع سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول ملتا ہے:

تین مسئلوں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ متعة الحج، متعة النساء اور مسح بر کفش۔[3]

بہر طور فنی قاعدوں اور اصول فقہ کے مقررہ ضوابط کی رو سے یہ بات طے شدہ ہے کہ ادھر روایات میں تضاد پیدا ہوا اور ادھر وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہوئیں۔

---

[1] صحیح مسلم ۲: ۱۰۲۶ ۔ ۲۷، سنن البیهقی ۷: ۲۰۵۔

[2] الصحاح ۶: ۲۳۹۳۔ لسان العرب ۱۴: ۳۳۷۔ جامع البیان للطبری ۵: ۹۔ التفسیر الکبیر للرازی ۱۰: ۵۰۔ تفسیر البحر المحیط لابن حیان ۳: ۲۱۸، الدر المنثور ۲: ۱۴۰

[3] وسائل الشیعه للحر العاملی ۲۱: ۵، ۸۰۔ الفقیه ۱: ۴۸۔ ۹۵

Marfat.com

کیونکہ مشکوک روایات قابل انکار اور ان کے مقابلے میں محکم احادیث لائق عمل ہوتی ہیں نیز جب کہ علمائے اسلام کے متفقہ فیصلے اور فقہی تکنیک کے مطابق متعہ کی مشروعیت اور اس کا جواز ثابت ہے اور تنسیخ مشکوک ہے تو اس کی اباحت کا اقرار کرنا پڑے گا۔

مسئلہ کا واحد حل

اب اگر ہم حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں۔ معاملے کی پوری چھان بین کریں اور اس کی تمام کڑیوں کو ملا کر صحیح نتیجہ نکالنا چاہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی رائے سے متعہ کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ لیکن یہ ممانعت دینی نہیں بلکہ قطعی طور سماجی حالات اور وقتی تقاضوں پر مبنی تھی۔ دین، مذہب کا اس سے کوئی سروکار ممکن نہیں۔ چنانچہ تواتر کے ساتھ آپ کا یہ قول نقل ہوتا چلا آ رہا ہے:

رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں دو متعہ جائز تھے، مگر میں انہیں حرام قرار دیتا ہوں اور خلاف ورزی پر سزا دوں گا۔[1]

یہاں پر غور طلب چیز یہ ہے کہ خلیفہ ثانی نے حرمت یا تنسیخ کے حکم کو سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب نہیں کیا بلکہ خود اپنی ذات کو ذمہ دار ٹھہرایا نیز سزا کا تعلق بھی اپنے ہی سے رکھا، خدا سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے ورنہ پھر ان خطوط پر سوچنا پڑے گا کہ حضرت عمر جیسی شخصیت اور دین الٰہی میں بے محابانہ کتر بیونت! لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں آپ کے مقام کو دیکھتے ہوئے اس انداز فکر کا اختیار کرنا کس قدر مشکل ہے۔

کیا حضرت عمرؓ یہ نہیں جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلال قیامت تک حلال اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ تا حشر حرام رہیں گی؟

خداوند عالم خود اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرماتا ہے:

---

[1] السنن الکبری للبیہقی ۷:۲۰۶۔ زادالمعاد لابن قیم الجوزی ۳:۴۶۳۔ المبسوط للسرخسی ۴:۲۷۔

Marfat.com

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ [1]

اگر رسول ہمارے متعلق کچھ باتیں گھڑ لیتا تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر گلا کاٹے بغیر نہ چھوڑتے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ تم میں سے کوئی آ کر بچا لیتا۔

بہرطور یہی بہتر تھا کہ حضرت عمر کے امتناعی حکم کو مذہبی حیثیت دینے کی بجائے اسے سیاسی یا سماجی قدغن قرار دیا جاتا۔ مگر کیا کہا جائے کہ آپ کے بعض معاصرین نیز بعد کے کچھ سادہ لوح محدثین نے اس باریک نکتہ پر غور نہیں کیا اور فرط عقیدت میں اپنے قائد کے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لیے نسخ کی دلیل تراشی اور اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا۔ نتیجتاً ان کے دبستان فکر میں وہ خلفشار پیدا ہوا کہ پناہ بخدا! فی الواقع یہ حضرات اگر وہ مؤقف اختیار کرتے جس کی ہم نے نشاندہی کی ہے تو اتنی الجھنوں میں نہ پڑتے۔

صحیح مسلم کے حوالے سے جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت کا تذکرہ کیا جا چکا ہے:

دور نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور عہد ابوبکر میں تو ہم ایک مٹھی کھجور اور مٹھی بھر ستو دے کر متعہ کر لیا کرتے تھے۔ لیکن عمرو بن حریث کے سلسلے میں عمر نے ممانعت کر دی۔

یہ بڑا واضح ثبوت ہے کہ ایک خاص واقعہ کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے اپنی ذاتی ناپسندیدگی کے باعث اسے ممنوع قرار دے دیا تھا اور ممکن ہے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ ناگوار معاملہ پیش ہوا ہو اور آپ نے اپنی تیز مزاجی سے مجبور ہو کر ممانعت کا حکم صادر کر دیا ہو، ورنہ متعہ کے سلسلہ میں نص قرآنی، سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عمل صحابہ نیز حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کا تعامل اور خود حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک متعہ کا رواج، یہ سب ایسے حقائق ہیں جو بحث وتمحیص سے بالاتر ہیں۔

تاریخ وحدیث کی کتب شاہد ہیں کہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بڑے

---

[1] الحاقة: ۴۴ تا ۴۷

Marfat.com

بڑے صحابی اور خاندان قریش کے مشہور افراد متعہ کیا کرتے تھے اور اس قسم کے عقد سے ان کی نسل چلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔

چنانچہ سواد اعظم کے معتبر و مستند عالم راغب اصفہانی اپنی شہرہ آفاق تصنیف المحاضرات میں فرماتے ہیں:

متعہ کو حلال کہنے کے سلسلے میں ایک مرتبہ عبد اللہ بن زبیر نے جناب عبد اللہ بن عباس کو طعنہ دیا۔ اس پر ابن عباس نے فرمایا: اچھا، ذرا اپنی والدہ سے تو پوچھو کہ ان میں اور تمہارے والد بزرگوار میں ازدواجی تعلقات کیسے استوار ہوئے؟

عبداللہ بن زبیر نے جاکر ماں سے پوچھا: بتایئے، یہ کیا قصہ ہے؟

انہوں نے صاف صاف کہدیا: بیٹا! تم متعہ سے پیدا ہوئے ہو![1]

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ عبد اللہؓ کی والدہ جناب اسماء ذات النطاقین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی اور ام المومنین جناب عائشہؓ کی بہن تھیں۔ جنہیں صحابی رسول زبیرؓ بن العوام نے متعہ کے ذریعہ اپنی زوجیت میں لیا تھا۔

انکار کرنے والے دیکھیے اب کیا فرماتے ہیں؟

اس واقعہ کے بعد راغب اصفہانی نے ایک اور روایت لکھی ہے اور وہ یہ کہ بصرہ کے کسی بزرگ نے یحییٰ بن اکثم سے دریافت کیا کہ جواز متعہ کے سلسلہ میں جناب کس کی پیروی فرماتے ہیں؟

یحییٰ نے جواب دیا: عمر بن الخطاب کی۔

سائل نے کہا: یہ کیسے، وہ تو اس معاملے میں بڑے ہی سخت گیر تھے۔

یحییٰ نے کہا: ہاں! مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عمر نے ایک دفعہ برسر منبر اعلان فرمایا تھا کہ لوگو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو متعہ حلال کیے تھے مگر میں انہیں حرام قرار دیتا ہوں نیز خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دوں گا۔ لہٰذا ہم ان کی گواہی کو تو قابل قبول سمجھتے ہیں، لیکن موصوف کا حکم ہمارے نزدیک

---

[1] محاضرات الادباء ۳: ۲۱۴۔

Marfat.com

نزدیک لائق تعمیل نہیں۔[1]

عبداللہ بن عمر کے بیان کا بھی تقریباً یہی مفہوم ہے۔[2]

البتہ اس ضمن میں خلیفہ ثانی کا جو جملہ شہرت عام رکھتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

مُتعَتَانِ کانَتَا عَلٰی عَھدِ رَسُولِ اللّٰہِ وَ اَنَا اُحَرِّمُھُمَا.

عہد رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں دو متعہ تھے اور میں انہیں حرام کرتا ہوں!

یہاں مکرر عرض ہے کہ اگر حضرت عمر کی ممانعت اسی قسم کی تھی، جس پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں، تب تو معاملہ قدرے آسان ہے، ورنہ سخت مشکل!

اس منزل پر ہمیں پانچویں صدی ہجری کے محقق کامل محمد بن ادریس حلی کا بھی ایک شہ پارہ یاد آ گیا جسے مطابقت اور توضیح مزید کے خیال سے نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ ممدوح جنہیں ہمارے علمائے متقدمین میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے، اپنی بلند پایہ تصنیف السرائر میں ارشاد فرماتے ہیں:

> نکاح موقت شریعت اسلامی میں جائز ہے اور کتاب خدا نیز مسلمانوں کے مسلسل اتفاق سے ازروئے سنت بھی اس کی مشروعیت ثابت ہے۔ البتہ کچھ لوگوں نے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر اس کی درستی محتاج دلیل ہے۔ علاوہ ازیں صحیح دلائل سے یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ ہر سودمند کام جس سے حال واستقبال میں کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو وہ عقلی طور پر مباح ہے اور نکاح متعہ میں یہ وصف موجود ہے۔ بنابراین عقلاً اس کے جواز کا اقرار ضروری ہے۔
>
> اب اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ مستقبل میں اس کے ضرر رساں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے جب کہ اس بارے میں مخالف آراء بھی موجود ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بار ثبوت اس پر ہے جو امکان ضرر کا مدعی ہو۔

---

[1] محاضرات الادباء ۳:۲۱۴ [2] سنن ترمذی ۳:۱۸۵۔۸۲۴

Marfat.com

علاوہ ازیں مسلمانوں کا اجماع بھی اس کا واضح ثبوت ہے اور یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عقد متعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مباح تھا مگر بعد میں حرمت اور تنسیخ کے دعوے ہونے لگے جو ثابت نہیں کیے جاسکے، جب کہ اباحت متفقہ طور پر ناقابل انکار ہے۔ لہٰذا مدعیان نسخ وتحریم کی جانب سے کوئی تسلی بخش جواب ملنا چاہیے۔

اب اگر وہ ان روایات کو دہراتے ہیں جن میں حکم امتناعی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب ہے تو پھر انہیں یہ سننا پڑے گا کہ اس قماش کی تمام احادیث (بشرطیکہ صحیح بھی ہوں) اخبار احاد ہیں جو شریعت کی دنیا میں علم وعمل کا موجب قرار نہیں پا سکتیں اور نہ ایسی روایتوں کی بنیاد پر حقائق ثابتہ سے روگردانی جائز ہے۔

محرمات کے تذکرے کے بعد خداوند عالم اپنی کتاب اقدس میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ [1]

ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لیے جائز ہیں مگر شرط یہ ہے کہ بدکاری نہیں بلکہ عفت اخلاق کی غرض سے زر مہر دے کر نکاح کرنا چاہو، ہاں جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہو انہیں معینہ مہر ادا کردو اور مہر کے بارے میں اگر آپس میں مفاہمت کر لو تو کوئی حرج نہیں۔

آیۂ وافی ہدایہ میں بحث طلب لفظ اسْتَمْتَعْتُمْ ہے جس کے بس دو معنی ہیں: ۱۔ انتفاع ۲۔ التذاذ

---

[1] النساء: ۲۴

Marfat.com

دوسرا مفہوم لغوی ہے اور پہلا اصطلاحی، جس سے مراد وہ موقت اور مخصوص عقد ہے جو مقصود شرع ہے۔

اب یہاں لغوی مفہوم تو قابل اعتنا ہونے سے رہا، کیونکہ اصول فقہ کے مطابق مسلمہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر قرآن کے کسی لفظ سے دو مطلب نکلتے ہوں، ایک لغوی اور دوسرا وہ جسے شریعت نے رائج کیا ہو تو ایسی صورت میں لغت پر اعتبار نہیں کیا جائے گا، شریعت کی بات ماننی پڑے گی اور یہی وجہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام اور حج کے سلسلہ میں کسی فرہنگ پر نہیں بلکہ عرف شرع پر اعتماد کیا جاتا ہے نیز اس سے پہلے صراحت ہو چکی ہے کہ صحابہ و تابعین کا ایک مشہور و معروف گروہ اباحت متعہ کا قائل تھا جیسے امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام، عبداللہ بن عباسؓ جو اس موضوع پر ابن زبیرؓ سے مناظرے کرتے رہے اور ان مناظروں کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ نہ صرف زباں زد عام ہوئے بلکہ اس زمانے کے شعراء نے بھی طبع آزمائی کی۔ چنانچہ ایک سخنور کہتا ہے۔

اَقُولُ لِلشَّیخِ لَمَّا طَالَ مَجلِسُہُ
یَاصَاحَ ھَل لَّکَ فِی فَتوی ابنِ عَبَّاسٍ

نیز عبداللہ بن مسعود، مجاہد، عطا، جابر بن عبداللہ انصاری، سلمہ ابن الاکوع، ابی سعید الخدری، مغیرہ بن شعبہ، سعید بن جبیر اور ابن جریج وغیرہم یہ سب کے سب جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ لہٰذا عقد منقطع کے خلاف جانے والوں کا ادعاء صحیح نہیں۔[1]

ارباب بصیرت ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بحث میں کتنی متانت پختگی اور قوت پائی جاتی ہے۔ خیر! یہاں تک تو اس موضوع پر صرف دینی اور تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی۔

اب آیئے ذرا اخلاقی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیتے چلیں۔

---

[1] السرائر ۲: ۶۱۸_۶۲۰

Marfat.com

اسلام دنیا کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ توحید کے رسیلے نغمے امرت بن کر چار سو پھیلے، جن سے غم نصیب انسانیت کو بے پایاں سکون حاصل ہوا۔ جس طرح یہ مانی ہوئی بات ہے، اسی طرح اس حقیقت کا اعتراف بھی لازم ہے کہ دین مبین ہر زمانے کا ساتھ دیتا ہے۔ ہر وقت کے تقاضے پورے کرتا ہے نیز عالم بشری کی جملہ دنیوی و اخروی ضروریات کا کفیل اور ہر گونہ فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ آئین رحمت میں زحمت کا سوال ہی نہیں۔ آنکھوں سکھ، کلیجے ٹھنڈک! ایک دنیا کیا تمام عالموں کے لیے برکت۔ اسی لیے تو یہ کامل ترین مذہب اور آخری شریعت بننے کا حقدار ٹھہرا۔ کون نہیں جانتا کہ قانون الٰہی نے انسانی معاشرے کو ایسا سنوارا کہ کسی اور دستور کی حاجت نہ رہی۔

اتنا جاننے کے بعد اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو کبھی سفر کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ نفی میں جواب ممکن نہیں۔ کیونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ لوگ عموماً سفر کرتے ہیں بلکہ غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا اور اپنے شعور سے کام لینا شروع کیا، اس وقت سے اس نے اپنی معاش کے لیے جو وسیلے اختیار کیے، ان میں سفر کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مختلف ضرورتیں آدمی کو راہ غربت طے کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً تجارت، ملازمت، تحصیل علم یا جنگ اور دفاع وغیرہ اور یہ بھی مسلم ہے کہ مذکورہ اغراض کے سلسلہ میں نوجوان یا کم از کم توانا افراد ہی دور دراز ملکوں کا عزم کر سکتے ہیں اور کسے معلوم نہیں کہ اس حکیم مطلق نے بقائے نسل اور حفظ نوع کے لیے ہیکل انسانی میں جنسی خواہش بھی ودیعت فرمائی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک مسافر آدمی عقد دائم کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہوتا ہے نیز لونڈیوں، باندیوں کی فراہمی بھی آسان نہیں (آج کل تو ناممکن ہے)، لہٰذا ان حالات میں مدت کے بچھڑے ہوئے اس پردیسی کو کیا کرنا چاہیے جو اتفاق سے نوعمر بھی ہو اور مجبور بھی؟ بس دو ہی صورتیں ممکن ہیں: ضبط نفس یا بدکاری۔

ا۔ مگر ضبط نفس میں نہ صرف مہلک قسم کی مختلف بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے بلکہ نسل کا منقطع ہو جانا بھی کچھ بعید نہیں اور یہ منافی حکمت ہے۔ شریعت اسلامی بڑی آسان اور آرام دہ شریعت ہے:

Marfat.com

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ [1]

خدا تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ [2]

اور امور دین میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی۔

سہولت چاہیے ہے، شدت نہیں، مقصود دین میں کسی پہلو تکلیف نہیں!

۲۔ جنسی بے راہروی سے خدا محفوظ رکھے۔ آج دنیا کے بیشتر حصے اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

سچی بات یہ ہے، اگر مسلمان صحیح طریقہ سے شرعی قوانین پر عمل پیرا ہو جائیں تو حسب وعدۂ خداوندی یہ کائنات ان کے لیے سراپا رحمت بن جائے اور اچھے دن پھر واپس آ جائیں:

لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ [3]

ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے۔

متعہ بھی دین اسلام کا ایک سودمند قانون ہے۔ اگر مسلمان اس کی شرائط کا لحاظ کرتے یعنی عقد عدہ اور محافظت نسل پر نظر رکھ کر عمل پیرا ہوتے تو بڑی حد تک بدکاریوں کا انسداد ہو جاتا۔ عزتیں محفوظ رہتیں۔ حلال نسلیں بڑھتیں، دنیا ناجائز بچوں سے نجات پاتی اور اخلاقی قدروں کو فروغ حاصل ہوتا۔

رئیس ملت حضرت عبد اللہؓ بن عباس کے اس جاودانی قول کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں:

> متعہ ایک رحمت تھا، جس سے خداوند عالم نے امت محمدیہ کو نوازا تھا اور اگر اس سے منع نہ کیا جاتا تو سوائے گئے گزرے لوگوں کے اور کوئی زنا کا مرتکب نہ ہوتا۔ [4]

ابن عباس کے اس پر مغز بیان میں ان کے جلیل القدر استاد اور مربی، حکیم

---

[1] البقرة: ۱۸۵ — [2] الحج: ۷۸

[3] الاعراف: ۹۶ — [4] النهاية ۲: ۲۸۸۔ الفائق ۲: ۲۵۵

Marfat.com

الٰہی امیرالمؤمنین علیہ السلام کی تعلیم کے اثرات جھلک رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلامی نے اس نیکی سے منہ موڑ کر اپنی بدنصیبی کا سامنا کیا ہے۔

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ...[1]

تم ایسی چیز کو جو ہر طرح بہتر ہے ادنیٰ چیز سے بدلنا چاہتے ہو۔

وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

طلاق

گزشتہ مباحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ تزویج کی حقیقت وہ خاص ربط ہے جو مرد اور عورت کے درمیان قائم ہوتا ہے اور دو مختلف افراد کو ایک دوسرے کا قرین اور کفو بنا دیتا ہے۔ عائلی نظام میں زن و شوہر کے توافق و اشتراک کو دونوں آنکھوں اور ہاتھوں سے تشبیہ دینا چاہیے۔ ایک دوسرے کے ساتھی ایک دوسرے کے ساجھی۔ یہ امر اپنی جگہ کس قدر لائق توجہ ہے کہ وہ دو ہستیاں جو آپس میں بالکل غیر ہوتی ہیں عقد زواج انہیں اس مضبوطی سے ملا دیتا ہے اور شدت سے ان میں اتحاد پیدا کرتا ہے کہ اس سے زیادہ مستحکم علاقہ یگانگت کا تصور ناممکن ہے، بلکہ اس خصوصی وابستگی اور اس کے گہرے اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے کلام الٰہی کی اس آیت کے علاوہ اور کوئی مناسب و موزوں عبارت سمجھ میں نہیں آتی۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ[2]

وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو!

واقعہ یہ ہے کہ اس آیۂ وافی ہدایہ میں اس قدر معجزانہ محاسن اور محیر العقول نکات پنہاں ہیں جن کے اعتراف سے قلم قاصر ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس رشتہ کا قدرتی تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مرتے دم تک نہ ٹوٹے، بلکہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے مگر یہ کہ کوئی ایسی شکل نکل آئے جس کے باعث مشترکہ زندگی بسر کرنے کا مذکورہ معاہدہ ختم ہو جائے۔ بسا اوقات کچھ ایسے ناگزیر حالات واقعات اور ضرورتیں پیش آ جاتی ہیں جن کی وجہ سے اس گرہ کا کھولنا لازم ہو

---

[1] البقرۃ: ۶۱ [2] البقرۃ: ۱۸۷

Marfat.com

جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی چند صورتیں ہیں:

۱۔ علیحدگی کی خواہش دونوں طرف سے ہو۔

۲۔ ایک ہی فریق معاہدہ توڑنے پر اصرار کرے۔

شریعت نے ہر موقع کے لیے ایسے قواعد مقرر کیے ہیں جن کی رو سے جدائی ممکن ہو جاتی ہے۔

مثلاً اگر نفرت و کراہت کا اظہار شوہر کی جانب سے ہو تو اسے طلاق کا اختیار ہے اور اگر ناپسندیدگی زوجہ کی طرف سے ہو تو وہ خلع حاصل کر سکتی ہے نیز اگر ناراضگی میں دونوں شریک ہوں تو پھر ضابطہ مبارات کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے کچھ احکام کچھ شرائط اور خاص مواقع ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا واجب ہے۔

اسلام چونکہ ایک اجتماعی دین ہے اور اس کی عمارت وحدت و یکتائی کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے اور اس مذہب کا سب سے بڑا مقصد محبت و اتفاق ہے، اس لیے اس کی حدوں میں انتشار اور تفرقہ کو انتہائی مذموم سمجھا جاتا ہے۔ بنا بر ایں اکثر روایات میں طلاق کی کراہت کا ذکر موجود ہے اور بعض احادیث میں وارد ہوا ہے: حلال خدا میں طلاق سے زیادہ کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں![1]

اس لیے شرع مقدس نے طلاق کے سلسلہ میں کچھ شرطیں لگا دیں اور بعض قیود عائد کر دیں تاکہ اس نوع کے حادثے کم سے کم تعداد میں وقوع پذیر ہوں۔

چنانچہ امامیہ مذہب کے احکام طلاق میں شاہدین عدلین کا ہونا لازم ہے۔

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ[2]

اپنے لوگوں میں سے دو عادلوں کو گواہ قرار دے لو۔

اگر دو عادل گواہوں کے بغیر طلاق دی جائے گی تو وہ باطل متصور ہو گی۔

یہ شرط باہمی نفرت کو ختم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ کیونکہ نیک اور عادل نفوس کو معاشرہ میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ان کی شخصیت عام دلوں پر خاصا اثر کرتی ہے نیز گواہ جب اچھی صفات کے حامل ہوں گے تو وعظ و نصیحت اور صلح و صفائی کی جانب توجہ دینا اپنا فرض سمجھیں گے۔ ہاں! یہ ضروری نہیں کہ ہر موقع پر ان کی

---

[1] اصول الکافی ۶: ۵۴۔۲،۳ [2] الطلاق: ۲

Marfat.com

کوششیں بارآور ہو جائیں۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس طریقہ سے فارغ خطی کے واقعات میں کافی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

مگر افسوس کہ برادارن اہل سنت نے اس سلسلہ میں خاص توجہ نہیں دی اور انہوں نے طلاق کے لیے شاہدین عدلین کی موجودگی کو لازم نہیں قرار دیا۔ نتیجتاً ان کے ہاں طلاق کا دائرہ اتنا پھیلا کہ سخت مشکل آن پڑی۔ شریعت کے مقدس اور بلند مقاصد نیز اس کے تمدنی اسرار و رموز سے تقریباً سب ہی غافل ہیں۔ کاش مسلمان پوری تندہی کے ساتھ احکام ربانی پر عمل پیرا ہوں تاکہ کم از کم ان کی عائلی زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہوتی ہیں اور خانگی نظام میں جو ابتری پھیلتی ہے اس کا ازالہ ممکن ہو جائے۔

دوسری بڑی شرط یہ ہے کہ طلاق دہندہ مجبور، مشتعل اور بے حواس نہ ہو نیز طلاق پانے والی پاک ہو۔ اس طہر میں اس سے مباشرت نہ کی گئی ہو۔

فقہ جعفری میں طلاق ثلاث ایک ہی طلاق تسلیم کی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق دے دے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس پر حرام نہیں ہوتی۔ بغیر محلل کے اس سے رجوع کر لینا جائز ہے۔ البتہ اگر رجوع کے بعد پھر طلاق ہو جائے، اس کے بعد پھر رجوع اور پھر طلاق ہو تو تیسری بار وہ حرام ہو جائے گی اور پھر اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے نیز اگر نو بار یہی عمل جاری رہے تو نویں مرتبہ حرام موبد ہو جائے گی۔ یعنی اپنے پہلے خاوند پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار پائے گی۔

سواد اعظم کے بیشتر علماء نے طلاق ثلاث کے ضمن میں اختلاف کیا ہے۔ ان حضرات کے نقطہ نظر سے کسی شوہر کا اپنی زوجہ سے یہ کہہ دینا: میں نے تجھ کو تین مرتبہ طلاق دی، طلاق بائن ہے، جس میں بغیر محلل کے دوبارہ حلال ہونا ممکن نہیں۔ حالانکہ ان کی صحاح میں یہ صراحت موجود ہے: طلاق ثلاث، طلاق واحد ہی کے مانند ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم اور مسند احمد میں جناب ابن عباس سے مذکور ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> عہد رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، دور ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کے دو سال تک طلاق ثلاث طلاق واحد شمار ہوتی تھی، مگر حضرت عمر نے کہا کہ جس معاملہ میں انتظار چاہیے تھا، لوگوں نے

Marfat.com

اس میں جلد بازی شروع کر دی۔ پس اگر ہم اسے نافذ کر دیں (تو بہتر ہوگا)۔ چنانچہ یہ رواج پا گیا۔[1]

اور خود قرآن مجید واشگاف لفظوں میں اعلان کر رہا ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ[2]

طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد یا تو قاعدہ کے مطابق روک لینا چاہیے اور یا پھر اچھے برتاؤ کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ[3]

پس اگر تیسری دفعہ بھی طلاق (بائن) دے دے تو پھر جب تک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔

اسباب طلاق کی یہ ایک اجمالی بحث تھی۔ تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں جدائی کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً وہ عیوب و امراض جو موجب فسخ ہوتے ہیں۔ جیسے جنون، جذام اور عورتوں میں رتق و قرن کے عوارض نیز ظہار و ایلا بھی فراق پیدا کرتے ہیں۔

عدۂ وفات و طلاق کی اقسام، وطی شبہ اور ملک یمین کی متعلقہ تفصیل بھی مبسوط ذخیروں میں نظر آئے گی۔

شوہر کے مرنے پر بیوی کے لیے مطلق طور پر عدہ واجب ہے، خواہ وہ یائسہ، صغیرہ اور غیر مدخولہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن طلاق میں ان تینوں صورتوں کے علاوہ واجب ہے۔

البتہ ناجائز ہمبستری (زنا) میں عدہ نہیں۔

عدہ وفات کی مدت چار مہینے دس دن ہے اور حمل کی شکل میں ابعد الاجلین کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ یعنی وضع حمل اور عدہ وفات میں جو مدت زیادہ ہو اس کی پابندی لازم ہے۔

عدہ طلاق کی میعاد تین پاکیزگیاں یا تین ماہ کا عرصہ ہے۔ حاملہ کے لیے وضع حمل اور کنیز کے لیے آزاد عورت کی نصف مدت مقرر ہے۔

---

[1] صحیح مسلم ۲: ۱۰۹۹ ـ ۱۵ ـ مسند احمد ۱: ۳۱۴ [2] البقرۃ: ۲۲۹ [3] البقرۃ: ۲۳۰

Marfat.com

طلاق اگر تین مرتبہ واقع نہیں ہوئی ہے اور خلع کی صورت بھی نہیں ہے تو عدہ کے دوران شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ مگر عدہ کا زمانہ گزارنے کے بعد عورت کو اختیار حاصل ہے اور اس شکل میں دوبارہ نکاح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہمارے ہاں رجوع کے سلسلے میں دو گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ طلاق میں اسے لازم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن مستحب ہے نیز اس کے لیے خاص الفاظ استعمال کرنے کی بھی کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایسے الفاظ و اشارات ہی کافی ہیں جن سے منشا پورا ہو جائے۔

خلع و مبارات

علاقہ زوجیت اس وقت تک منقطع نہیں ہو سکتا جب تک دونوں فریق یا دونوں میں سے کوئی ایک ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرے۔ عموماً یہی جدائی کی علت ہوتی ہے۔

پس اگر نفرت صرف شوہر کی طرف سے ہے تو اس کے اختیار میں طلاق ہے۔ اس کے ذریعے اگر وہ چاہے تو چھٹکارہ حاصل کر سکتا ہے اور اگر زوجہ کراہت کرتی ہے تو اس کے لیے یہ قاعدہ ہے کہ وہ بطور فدیہ کچھ مال دے کر خواہ وہ زر مہر ہی کے برابر کیوں نہ ہو یا اس سے زیادہ کچھ دے کر مقررہ صیغہ جاری ہونے کے بعد آزاد ہو سکتی ہے۔ اسے خلع کہتے ہیں۔ اس میں بھی طلاق کی تمام شرطوں کا التزام ہے اور مزید برآں یہ کہ نفرت کا اظہار عورت ہی کی طرف سے ہو اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔

جیسا کہ کلام باری میں ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ [1]

پس اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ یہ دونوں حدود خداوندی کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت مرد کو کچھ دے کر چھٹکارا (خلع) حاصل کر لے تو اس میں دونوں کے لیے کوئی حرج نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

---

[1] البقرہ: ۲۲۹

Marfat.com

اس آیت کے ذیل میں اہل بیت (علیہم السلام) کی تفسیر یہ ہے کہ زوجہ اپنے شوہر سے یہ کہے کہ میں تیری قسم کا اعتبار نہیں کروں گی۔ تیرے بارے میں اللہ کے مقرر کیے ہوئے قانون کی پابندی نہیں کروں گی۔ ہم بستری کے لیے تیار نہیں ہوں گی اور تیرے گھر میں ناپسندیدہ عناصر کو جگہ دوں گی....[1]

ظاہر ہے کہ اس سے انتہائی نفرت کا اعلان ہوتا ہے اور ملاپ کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

لیکن اگر منافرت میں دونوں یکساں ہوں تو یہ مبارات کی شکل ہوگی۔ اس میں طلاق کی تمام شرائط کا پابند ہونا ضروری ہے۔ اس موقع پر شوہر کو زوجہ سے دیے ہوئے زرمہر سے زائد مال لینے کا حق نہیں۔

خلع و مبارات میں طلاق بائن ہوتی ہے جس میں شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ البتہ فدیہ کے بعد عورت کو یہ حق پہنچتا ہے۔ ایسی صورت میں مرد چاہے تو قاعدہ کے مطابق عدہ کے دوران رجوع کرسکتا ہے۔

ظہار، ایلاء، لعان

یہ اسباب بھی فی الجملہ تحریم کا باعث ہیں مگر اپنی خاص شرائط کے ساتھ جو فقہ کی کتب میں لکھی ہوئی ہیں۔ چونکہ ایسے حادثے کم ظہور پذیر ہوتے ہیں، بنا برایں یہاں ان سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔

وراثت

ایک مالک کے فوت ہونے سے دوسرے کے نام اس کے متروکہ اموال کے منتقل ہونے کو، اس نسبی یا سببی رشتہ کے باعث جو ان دونوں میں موجود ہو، وراثت کہتے ہیں۔

زندہ قرابت دار وارث، متوفی مورث اور استحقاق ارث کہلاتا ہے۔ ایک شخص کا دوسرے سے یا دونوں کا تیسرے سے متولد ہونا نسب ہے۔

---

[1] تفسیر العیاشی ۱: ۱۱۷۔ ۳۶۷۔ تفسیر القمی ۱: ۷۵۔ مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۱: ۳۲۹

Marfat.com

اگر کسی وارث کا حق کتاب الٰہی میں معین ہے تو وہ اس زمرے میں شمار ہوگا جو باعتبار فرض ورثہ پاتے ہیں، ورنہ وہ قرابت کے لحاظ سے ورثہ دار ہوگا۔ قرآن مجید میں منصوص حصے چھ ہیں۔ حصص اور حقداروں کی تشریح حسب ذیل ہے:

۱۔ نصف: شوہر، بشرطیکہ زوجہ کا کوئی لڑکا نہ ہو، اکلوتی لڑکی اور بہن!

۲۔ ربع:

الف۔ شوہر: جب زوجہ کا لڑکا موجود ہو۔

ب۔ زوجہ: بشرطیکہ شوہر کا فرزند نہ ہو۔

۳۔ ثمن: بیوی، لڑکے کی موجودگی میں۔

۴۔ ثلث: ماں، لڑکے اور مورث کے بھائیوں کے نہ ہونے کی صورت میں نیز کلالہ مادری کے متعدد افراد۔

۵۔ دو ثلث: دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں اور بہنوں کا بھی یہی حکم ہے، بشرطیکہ کوئی لڑکا نہ ہو۔

۶۔ سدس: ماں باپ میں سے ہر ایک۔ لڑکے کی موجودگی میں نیز کلالہ مادری کا ایک فرد خواہ مرد ہو یا عورت۔

اور جو اس جدول (چارٹ) میں نہیں آتے ہیں، وہ قرابت داری کی وجہ سے وارث ہوں گے۔

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ

عورت کے مقابلے میں مرد کا حصہ دگنا ہے۔

نسبی وارثوں کے تین طبقے ہیں:

۱۔ ماں، باپ، اولاد، نیچے تک۔

۲۔ اجداد، اوپر تک، بھائی نیچے تک۔

۳۔ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ جو سب اولی الارحام ہیں۔ ان میں کوئی بھی صاحب فرض نہیں۔ اس سلسلے میں کلی قاعدہ یہ ہے کہ قریب کی موجودگی میں بعید قطعاً وارث نہیں ہو سکتا۔ یعنی نزدیکی قرابت دار کے ہوتے ہوئے دور کے رشتہ دار کو ورثہ نہیں ملے گا۔

Marfat.com

شیعہ اور اہل سنت کے درمیان عول اور تعصیب کے باقی مسائل وارثت میں چنداں اختلاف نہیں۔

امامیہ فقہ میں اہل بیت اطہار علیہم السلام کے طریقوں سے تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ وراثت میں نہ عول ہے نہ تعصیب[2] اور یہی اعاظم صحابہ کا بھی مسلک تھا۔ چنانچہ ابن عباسؓ کے اس مشہور و معروف بیان کو سنداً پیش کیا جا سکتا ہے جس میں آپ نے عول و تعصیب کی نفی فرمائی ہے۔[3] اس کے علاوہ بھی کافی دلائل موجود ہیں۔

حبـوہ متوفی کے فرزند اکبر کا حصہ ہے۔ اس میں مورث کے کپڑے، تلوار، قرآن اور انگشتری شامل ہے۔

زوجہ کو اراضی مزروعہ و غیر مزروعہ پر کوئی حق نہیں۔ اسی طرح جائیداد غیر منقولہ میں سے اسے عمارتوں اور درختوں کی صرف قیمت (بقدر حصہ) ادا ہو گی۔ اصل پر قبضہ نہیں دیا جائے گا۔ ان دو مسائل میں شیعہ منفرد ہیں اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے اقوال سے ان نظریات کی تائید ہوتی ہے۔

وقف، ہبہ اور صدقات

وہ مال جو کسی کی ملکیت ہو اور پھر اسے وہ اپنے تصرف سے نکالنا چاہے تو یا تو یہ اخراج مطلق حیثیت سے ہو گا، یعنی جائیداد نہ صرف یہ کہ صاحب جائیداد کے قبضہ سے خارج ہو جائے بلکہ قطعی طور پر ہر شخص کے لیے ناقابل ملکیت ہو جائے۔ جیسے غلام کو آزادی بخش دی یا کسی مکان و زمین کو ملکیت سے جدا کر کے عبادت کدہ، مسجد یا زیارت گاہ بنا دیا۔ اس نوعیت کے اقدام سے کوئی جائیداد کبھی کسی سبب اور وجہ سے دوبارہ کسی کی بھی ملکیت میں نہیں آ سکتی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ ملکیت سے الگ ہونے میں صرف یہ پہلو ملحوظ رکھا جائے کہ وہ ایک مالک کے تصرف سے نکل کر دوسرے کے قبضہ میں چلی جائے۔ اب یہ عمل

---

[1] النساء: ۱۱ [2] علل و الشرائع: ۵۶۸-۲- عیون اخبار الامام الرضا (ع) ۲: ۱۲۵-

[3] علل والشرائع: ۵۶۸-۳- عیون اخبار الامام الرضا (ع) ۲: ۱۲۵-

Marfat.com

یا تو کسی مالی معاہدے کے تحت یا مفاہمت کی بنیاد پر ہوگا۔ جیسے خرید وفروخت، بیع وفا اور صلح وغیرہ اور یا پھر اس میں مالی معاوضے کا کوئی تصور نہیں ہوگا۔

دوسری شکل میں اگر مقصد اجر وثواب وللّٰہیت ہے تو عام مفہوم میں اسے صدقہ کہیں گے نیز اگر مال اس قسم کا ہے کہ قابل لحاظ مدت تک رہ سکے اور صدقہ دینے کی نیت بھی یہی ہو کہ مال رہے اور نفع امور خیر میں کام آئے تو یہ وقف کہلائے گا۔

لیکن اگر مال رہنے کے قابل نہیں اور خیرات دہندہ نے اس کی بقا کی شرط بھی نہیں لگائی ہے تو اسے خاص مفہوم میں صدقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر کسی شخص کو کسی اثاثے یا جائیداد کا مالک قرار دینے میں اجر وثواب مقصود نہ ہو تو اسے ہبہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس بخشش کے مقابلے میں کوئی معاوضہ طلب کر لیا جائے تو یہ ہبہ عوض کی شکل ہوگی۔ جیسے کوئی آدمی دوسرے سے کہے: میں تمہیں یہ کرتا ہبہ کرتا ہوں تم مجھے یہ کتاب ہبہ کردو۔ پس اگر طرف مقابل قبول کر لے تو لزوم عائد ہو جائے گا اور فریقین میں سے کوئی بھی اپنا مال دوبارہ لینے کا مجاز نہیں۔ مگر یہ کہ دونوں دوبارہ قول وقرار فسخ کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ ہبہ کی تمام صورتوں میں قبضہ شرط ہے۔

ہبہ جائزہ میں، یعنی جس میں کوئی معاوضہ حاصل نہ کیا گیا ہو، دی ہوئی چیز کا واپس لے لینا صحیح ہے۔ البتہ دی ہوئی چیز کا قرابت داروں (ذوی الارحام) شوہر یا زوجہ سے مانگنا جائز نہیں۔ اسی طرح تلف شدہ مال کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قبضہ کے بعد صدقات کا واپس لینا بھی درست نہیں، بلکہ اگر قبضہ نہ بھی ہو تب بھی ان کی بازیافت جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔

صیغہ وقف جاری کرنے کے بعد جب جائیداد متولی یا جن کے لیے وقف کی گئی ہے، ان کے قبضہ میں دے دی جائے نیز اگر خود واقف بھی تولیت کے ارادہ سے وقف کردہ جائیداد پر متصرف ہو جائے، تب بھی اسے دوبارہ واپس لینے، بیچنے، رہن رکھنے یا تقسیم کرنے کا حق نہیں رہتا، خواہ یہ وقف علی الاولاد ہی کیوں نہ ہو، جسے وقف خاص سے موسوم کیا جاتا ہے یا وقف عام ہو، جیسے غریبوں، ناداروں اور مساجد و مدارس کے نام موقوفہ جائیداد۔

Marfat.com

البتہ چند خاص مواقع ایسے ہیں جہاں استثنائی صورت پیدا ہوسکتی ہے، مثلاً:

۱۔ وقف کا خراب ہو جانا۔ مگر خرابی کی وہ صورت جس میں اصل سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو۔!

۲۔ برباد ہونے کا شدید اندیشہ جس میں نفع کی صورت ختم ہوتی نظر آ رہی ہو۔

۳۔ قابضوں کا ایسا اختلاف جس سے جان و مال اور عزت و آبرو کو گزند پہنچنے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔

مگر ان تمام حالات کے باوجود کسی شخص کو خود بیچنے یا حصے بخرے کرنے کا حق نہیں پہنچتا، بلکہ فیصلے کا دار و مدار حاکم شرع پر ہو گا۔ حاکم شرع ہی کو اختیار ہے کہ وہ جملہ کوائف کا جائزہ لے کر مناسب حکم صادر کرے۔

لیکن افسوس کہ اوقاف کے سلسلہ میں لوگ انتہائی مساوات میں پڑ گئے ہیں۔ حدود و شریعت کا خیال نہیں رہا اور مقررہ ضابطوں کی پرواہ نہیں کی جا رہی۔ بہرحال خداوند عالم سب کے عزم و عمل سے آگاہ ہے۔

مقدمات کے فیصلے

عہدہ قضا اور نظامت عدل و انصاف کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ ہے بھی انتہائی معزز رتبہ۔ امامیہ مذہب میں عدلیہ کی ذمہ داری کو نبوت، امامت اور ریاست عامہ کا ایک شعبہ تصور کیا جاتا ہے۔ پروردگار عالم ارشاد فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ [1]

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تم حق و انصاف کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کیا کرو۔

دوسرا فرمان ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [2]

---

[1] ص: ۲۶ [2] النساء: ۶۵

Marfat.com

قسم ہے تمہارے رب کی (اے رسول ص) جب تک یہ لوگ آپس کے جھگڑوں میں بغیر کسی تنگ دلی کے تم کو حکم نہیں بنائیں گے اور پوری طرح تمہارے فیصلے کو تسلیم نہیں کرلیں گے اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے۔

قاضی اور حاکم نوامیس ثلاثہ یعنی جان، مال اور عزت کے خدائی امانت دار ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس عہدہ میں قدم قدم پر سخت خطرے لاحق رہتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں احادیث کے مضمون پر غور کیا جائے تو کمال عظمت کو دیکھ کر پہاڑ بھی ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

قاضی کو جہنم کے کنارے پر سمجھنا چاہیے۔ فیصلہ دینے والے کی زبان دو انگاروں کے بیچ میں ہوتی ہے۔[1]

اے شریح! تم ایسی جگہ بیٹھے ہو جہاں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھتا ہے یا اس کا وصی علیہ السلام اور یا پھر کوئی شقی۔[2]

حدیث نبوی (ص) میں وارد ہوا ہے:

جسے قاضی بنا دیا گیا، اسے گویا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔[3]

اس قبیل کی اور بہت سی روائتیں ہیں۔

فقیہ جس حکم کو دلائل سے حاصل کرتا ہے، اگر وہ کسی کلی موضوع سے متعلق ہے تو اسے فتویٰ کہیں گے۔ جیسے بغیر اجازت دوسروں کے مال میں تصرف جائز نہیں۔ شوہر کے لیے اس کی بیوی حلال ہے اور غیر مرد کے لیے حرام!

لیکن اگر حکم کسی جزئی موضوع کے بارے میں ہے تو اسے فیصلے اور قضا کا نام دیا جائے گا۔ جیسے یہ زوجہ ہے، وہ اجنبیہ ہے۔ یہ زید کا مال ہے۔ وہ فلاں کی جائیداد ہے۔

فتویٰ ہو یا فیصلہ، یہ دونوں مجتہد عادل اور امام علیہ السلام کے نائب عام کے خصوصی فرائض ہیں۔ فیصلہ (قضا) جو فی الحقیقت کسی موضوع کی تشخیص ہوتا ہے، یہ خواہ مرافعہ اور

---

[1] التہذیب ۶: ۲۹۲۔ ۸۰۸   [2] اصول الکافی ۷: ۴۰۶ ض ۲۔ الفقیہ ۳: ۳۱۵ ۳۲۲۔ المقنع: ۱۳۲

[3] المقنعة: ۷۲۱۔ سنن ابی داؤد ۳: ۲۹۸۔ ۳۵۷۱۔ سنن ترمذی ۳: ۶۱۴۔ ۱۳۲۵۔ سنن ابن ماجہ ۲: ۷۷۴۔ ۲۳۰۸۔ مسند احمد ۲: ۲۳۰۔

Marfat.com

مقدمہ کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر، جیسے رویئت ہلال اوروقف و نسب وغیرہ کے متعلق صدور حکم، بہرکیف اس کے لیے غیر معمولی عقل وفہم اور ذکاوت و ذہانت درکار ہے، بلکہ فتویٰ فیصلہ سے زیادہ مشکل کام ہے۔

اب اگر کوئی ایسا شخص جس میں ان صفات کا فقدان ہو، اس کام کو انجام دینے لگے تو یقینی طور پر فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچے گا۔ بنا بر ایں امامیہ مذہب میں مجتہد عادل کے سوا کسی اور شخص کے لیے اس کام کی انجام دہی ناجائز قرار دی گئی ہے، بلکہ اسے گناہان کبیرہ میں شمار کیا جاتا ہے جس کی حدیں کفر سے جا ملتی ہیں۔

ہمارے اساتذہ کرام اور اعاظم علمائے شیعہ حکم نافذ کرنے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ چنانچہ ہمارا بھی یہی شعار ہے۔

فیصلے کا دار و مدار تین بنیادی امور پر ہوتا ہے۔

۱۔ اقرار

۲۔ بیّنہ (ثبوت)۔ بیّنہ سے مراد دو عادل گواہ ہیں۔

۳۔ قسم۔

اختلاف وتعارض کے موقعوں پر تقدیم وترجیح سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے، یہ قانون شہادت کی تفصیل طلب شقیں ہیں جن کی تصریح کا موقع نہیں۔ اس عنوان پر ہمارے فقہاء کی مستقل تصانیف موجود ہیں۔ اس عنوان پر ہم اپنی کتاب تحریر المجلۃ کی چوتھی جلد میں بھی خاصی روشنی ڈال چکے ہیں۔

جامع الشرائط حاکم کے حکم کو رد کرنے والا احکام خداوندی کو رد کرنے والا متصور ہوگا نیز جامع الشرائط حاکم کے فیصلے پر کسی دوسرے کو نظر ثانی کرنے کا حق نہیں۔ البتہ وہ خود اپنے فیصلے کا مکرر جائزہ لے سکتا ہے۔

ذبح و شکار

امامیہ کے نزدیک شریعت کا اساسی قاعدہ تو یہ ہے کہ جانوروں کا کھانا مطلق طور پر ناجائز ہے (یعنی کچھ شرائط کے ساتھ جائز ہوتا ہے) اور خون جہندہ رکھنے والے حیوانات موت سے نجس ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

نیز جانوروں کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ نجس العین ۲۔ طاہر العین۔

نجس العین وہ جانور ہیں جن کی طہارت ناممکن اور بہر صورت ان کا کھانا حرام ہے۔ جیسے کتا اور سور۔

دوسری قسم کے حیوانات اگر بغیر شرعی تزکیہ کے مر جائیں تو وہ بھی نجس العین ہوں گے اور ان کا کھانا بھی مطلقاً حرام ہو گا۔ خواہ پرند ہوں یا چرند، جنگلی ہوں یا پالتو اور خون جہندہ رکھتے ہوں یا نہ۔ لیکن اگر تزکیہ شرعی سے مرے ہیں تو مطلق طور پر طاہر العین ہوں گے۔

درندے اور وحوش حرام ہیں۔ اگرچہ وہ پاک ہی کیوں نہ ہوں۔

خون جہندہ رکھنے والے حیوانات کے تزکیہ کے دو طریقے ہیں:

۱۔ شکار: اس میں بھی حلال کرنے کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ اس سدھائے ہوئے کتے کے ذریعے شکار کیا جائے جو حکم مانتا ہو اور اپنا شکار کھانے کا عادی نہ ہو۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ کتے کو شکار پر چھوڑنے والا مسلمان ہو اور چھوڑتے وقت اس نے اللہ کا نام لیا ہو نیز شکاری کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

ب۔ تیر اندازی کے ذریعے شکار حاصل کیا جائے۔ اس میں تلوار، نیزہ بلکہ تمام آلات جارحہ اور لوہے کے جملہ نوک دار ہتھیار شامل ہیں۔ بندوق کی گولی بھی (آہنی ہو یا کسی اور دھات کی) ان ہی میں شمار ہو گی۔ مگر شرط یہ کہ اس قسم کے حربے استعمال کرنے والا مسلمان ہو اور ہتھیار چلاتے وقت اس نے اللہ کا نام لیا ہو۔ اگر سدھائے ہوئے کتے یا تیر و تفنگ سے شکار کا کام تمام ہو جائے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر صیاد اپنے صید کو زندہ پالے تو اس کا تزکیہ کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں دوسرے وسائل جیسے چیتے یا رسی کے پھندے سے کیا ہوا شکار ناجائز ہے۔ البتہ اگر زندہ ہاتھ آ جائے تو تزکیہ کے بعد جائز ہو گا۔

۲۔ شرعی ذبیحہ: اس کے لیے ہمارے ہاں پہلی شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان یا مسلمانوں کے حکم میں ہو (جیسے کسی مسلمان کا لڑکا یا کسی مسلمان کا ملا

Marfat.com

ہوا بچہ) دوسری شرط یہ کہ امکان میں ہوتے ہوئے لوہے کے ہتھیار سے حلال کیا جائے۔ مگر ضرورت کے وقت ہر اس چیز کا استعمال صحیح ہوگا جس سے معینہ رگیں کٹ جائیں۔ اللہ کا نام لینا بھی شرط ہے۔ قبلہ رخ ہونا بھی ضروری ہے نیز اوداج اربعۃ یعنی شہ رگوں اور نرخرے کا کٹنا لازمی ہے۔ البتہ اونٹ کے لیے ذبح کی جگہ نحر کافی ہے اور باقی حیوانات کے سلسلہ میں اگر ذبح کرنا ناممکن ہوتو نحر کرنا جائز نہیں۔ مچھلی اگر پانی کے باہر مرجائے تو اس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔

اس موقعہ پر ہمیں ایک پر لطف واقعہ یاد آ گیا۔ محمد بن نعمان احول جنہیں مومن طاق کے نام سے شہرت حاصل ہے، بیان فرماتے ہیں:

ایک دفعہ میں ابوحنیفہ کے پاس گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے آگے کتب کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ جب ان کی مجھ پر نظر پڑی تو کہنے لگے:

یہ کتب دیکھ رہے ہو؟

میں نے کہا: جی ہاں! سامنے ہیں!

فرمانے لگے: تمام کی تمام طلاق کے موضوع پر ہیں!

میں نے کہا: اس سلسلے میں کلام الٰہی کی ایک آیت نے ہمیں آپ کی ان تمام کتب سے بے نیاز کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ [1]

اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے ہنگام دو اور عدت کا حساب رکھو۔

یہ سن کر آپ کہنے لگے: اچھا تم نے اپنے آقا (امام جعفر صادق علیہ السلام) سے کبھی یہ بھی پوچھا کہ دریائی گائے کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اس کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟

مومن طاق بیان کرتے ہیں:

میں نے کہا: جی ہاں! حضرت کا ارشاد ہے: چھلکوں والی ہر دریائی

---

[1] الطلاق :ا

Marfat.com

مخلوق، خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے، کھائی جاسکتی ہے اور جس کے چھلکے نہ ہوں اس کا کھانا حرام ہے۔"[1]

خورد و نوش

حیوانات کی تین اقسام ہیں:

۱۔ زمینی ۲۔ آبی ۳۔ ہوائی

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ آبی جانوروں میں سوائے چھلکوں والی مچھلی کے اور کوئی چیز حلال نہیں۔ مچھلی کے انڈے بھی مچھلی ہی کے حکم میں ہیں۔

زمینی حیوانات میں پالتو مویشی، جنگلی گائیں، پہاڑی مینڈھے نیز ہرن اور بارہ سنگھے جائز ہیں۔

گھوڑے، خچر اور گدھے مکروہ ہیں۔ نجاست کھانے والے جانور حرام ہیں، لیکن استبراء کے بعد کھائے جاسکتے ہیں۔

درندوں کی تمام قسمیں حرام ہیں۔ خرگوش، لومڑی، بجو اور نیولے وغیرہ۔

کیڑے مکوڑے، جیسے لال بیگ، کینچوے، سانپ، بچھو مطلقاً حرام ہیں۔

پرندوں میں درندگی کی صفت رکھنے والے طائر جیسے شکرے، باز، بہری وغیرہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

علاوہ ازیں شارع مقدس نے حلال پرندوں کی پہچان کے لیے تین حالات میں تین علامتیں قرار دی ہیں:

۱۔ طائر اگر فضا میں ہو تو اس کے پروں میں سکون سے زیادہ حرکت ہونی چاہیے۔

۲۔ زمین پر ہو تو اس کے پیر میں خار کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ ذبح شدہ حالت میں اگر پوٹا ہے تو وہ حلال ہوگا ورنہ حرام سمجھنا چاہیے۔

چمگادڑ، مور، بھڑیں اور مماکھی وغیرہ سب حرام ہیں۔ وہ کوا[1] جو نباتات کھاتا ہے، جائز ہے اور مردار کھانے والا کوا حرام ہے۔

---

[1] الاختصاص: ۲۰۶۔ رجال الکشی ۲: ۶۸۔۷۸۱ ان دو کتب میں مومن طاق کی بجائے حریز سے یہ واقعہ منقول ہے

Marfat.com

حیوانات کے علاوہ ناجائز خورد و نوش کو چار کلیات میں ضبط کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ہر غصب شدہ چیز کا استعمال حرام ہے۔

۲۔ ہر نجس شی حرام ہے۔

۳۔ ہر مضر حرام ہے۔

۴۔ ہر خبیث حرام ہے۔

سیال اشیاء میں سب سے زیادہ شدید حرمت پیشاب کی ہے اور اس سے بڑھ کر شراب ہے! نیز شراب کی جملہ اقسام (خمر، نبیذ، فقاع، عصیر، وغیرہ) سب حرام ہیں۔

امامیہ مذہب میں مسکرات کی حرمت و نجاست کے سلسلہ میں تمام اسلامی فرقوں سے زیادہ سخت احکام ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ائمہ طاہرین علیہم السلام سے جو روایات ملتی ہیں ان کے مضامین دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کشید کرنے والے، ذخیرہ اندوز، فروخت کنندہ اور مے نوش ان تمام پر نفرین کی گئی ہے۔ ہماری شریعت میں اسے ام الخبائث [۲] کہا جاتا ہے۔ اہل بیت علیہم السلام کی بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دسترخوان پر بیٹھنا بھی حرام ہے جس پر مسکرات کو جگہ دی گئی ہو۔ [۳] غالباً اس میں راز یہ ہے کہ لوگ شدت کے ساتھ ناجائز مشروبات سے پرہیز کریں تا کہ خورد و نوش کی دوسری اشیاء میں ان کی بو باس اور اثرات سرایت نہ کرنے پائیں۔ علوم جدیدہ کے ماہرین نے کیمیاوی تجزیے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ شراب بری بلا ہے۔ نہایت مضر، حد درجہ ہلاکت آفرین!

اسلام نے تیرہ سو سال پہلے ہی اس حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ آج وہ لوگ بھی اس سے کنارہ کش ہو رہے ہیں، جن کی شریعت اسے حرام قرار نہیں دیتی! شرع محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا تعریف ہو سکتی ہے! جو لوگ اس کی پابندی نہیں کرتے، وہ خود کو تباہی میں ڈالتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[۱] یہ کوا ہمارے ملک میں نہیں ہوتا۔ [۲] الوسائل ۵: ۲۹۶۔

[۳] اصول الکافی ۶: ۲۶۹-۲۔ الفقیہ ۴: ۴۱-۱۳۲۔ التہذیب ۹: ۱۱۶-۵۰۱۔

Marfat.com

حدود اور تعزیرات

حدود

نظام اجتماعی کی حفاظت اور ہیئت انسانی کی صیانت کے لیے چند خاص جرائم کی یہ فوری سزائیں ہیں:

حدزنا

ہر وہ بالغ و عاقل جو جانتے بوجھتے ہوئے کسی عورت کے ساتھ ناجائز جنسی اختلاط کرے گا تو صاحب اختیار حاکم پر واجب ہوگا کہ اسے سو کوڑے لگائے نیز اس کا سر منڈوا کر ایک سال کے لیے شہر بدر کروا دے اور اگر زنائے محصنہ کا مرتکب ہوا ہے تو سنگسار کیا جائے گا۔

پھر اگر عورت بھی راضی ہو تو شوہر ہونے کی صورت میں اس کو بھی یہی سزا ملے گی، ورنہ صرف سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے اپنی محرمات نسبی، رضاعی یا سوتیلی ماں کے ساتھ ناجائز فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کوئی ذمی کسی مسلمان خاتون سے زنا کرے تو اسے قتل کیا جائے گا، زنا بالجبر کی بھی یہی سزا ہے۔

زنا کے ثبوت کے لیے مجرم کا چار مرتبہ اقبال کرنا یا چار عادل گواہوں کی شہادت ضروری ہے۔ تین مرد اور دو عورتیں بھی کافی ہیں۔

اگر دو مردوں اور چار عورتوں نے گواہی دی ہے تو صرف کوڑے لگیں گے، سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ اس سے کم میں زنا کا ثبوت مکمل نہیں سمجھا جا سکتا نیز اگر دو یا تین

Marfat.com

آدمیوں نے شہادت دی تو انہیں قذف (تہمت) کی سزا دی جائے گی۔ گواہوں کی گواہی میں کامل اتفاق اور مشاہدہ شرط ہے۔

مجرم اگر سنگساری کے بموجب اقرار کر کے انکار کر جائے تو وہ حد ساقط ہو جائے گی اور اگر اقرار کے بعد توبہ کر لے تو حاکم کو اختیار ہے نیز گواہیوں کے بعد توبہ کرنے سے حد ساقط نہیں ہو گی۔ دو دفعہ کا سزا یافتہ مجرم اگر تیسری مرتبہ ارتکاب جرم کرے گا تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔

حاملہ پر وضع حمل تک اور بیمار پر صحت مند ہونے تک حد جاری نہیں کی جا سکتی۔

لواط اور سحق کی سزائیں

کسی جرم و گناہ کی اتنی سزا نہیں جتنی اس معصیت کے لیے قرار دی گئی ہے۔ سوائے اس مقام کے اور کہیں بھی آگ سے جلانے کی اجازت نہیں! خلاف وضع فطری عمل کرنے والے کے لیے حاکم وقت مفصلہ ذیل سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا تجویز کر سکتا ہے:

قتل، سنگساری، بلندی سے گرا کر ہڈیاں چور کر دینا، آگ میں جلانا۔ مفعول اگر بالغ و بااختیار ہے تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی اور کمسن کے لیے تعزیری کارروائی ہو گی۔

لواطت کے ثبوت کے لیے بھی یہی شرائط ہیں، جو زنا میں معتبر ہیں۔ اسی طرح سحق میں فاعلہ اور مفعولہ دونوں پر سو، سو کوڑوں کی حد جاری ہو گی نیز شوہر دار ہونے کی صورت میں سنگساری کی سزا بھی بعید نہیں۔

دلالوں کے لیے پچھتر کوڑے مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں سر منڈوا کر شہر بدر بھی کیا جائے گا۔ ثبوت کے لیے دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار کرنا کافی ہے۔

تہمت کی سزا

اگر کوئی شخص کسی عاقل و بالغ اور آزاد مسلمان پر کوئی ایسا الزام عائد کرے جس پر حد جاری ہو سکتی ہے۔ مثلاً زنا، لواط اور شراب نوشی کی تہمت، تو اس جرم کی پاداش میں اسے اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ قابل قبول ثبوت یا جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کی تصدیق سے حد ساقط ہو جائے گی۔

Marfat.com

دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار سے جرم صحیح سمجھا جائے گا۔

ناپسندیدہ خطاب مثلاً کسی کو فاسق فاجر، جذامی یا برصی کہنا بھی قابل تعزیر ہے۔

نیز وہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے یا چہاردہ معصومین علیہم السلام میں سے کسی پر سب وشتم کرے تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔

مسکر کی سزا

مے نوش یا عہد قدیم و جدید کی کوئی نشہ آور چیز استعمال کرنے والے کی حد ۸۰ کوڑے ہیں جو ننگی پیٹھ اور شانے پر لگائے جائیں گے۔ تین دفعہ کا سزا یافتہ اگر چوتھی مرتبہ جرم کا ارتکاب کرے گا تو قتل کیا جائے گا۔ شراب کو حلال سمجھنے والا مرتد ہے اور اس کی بھی یہی سزا ہے۔

شراب بیچنے والا اگر اپنے پیشے سے تائب ہو جائے تو فبہا، ورنہ وہ بھی قتل کی سزا کا مستحق ہوگا۔

چوری کی سزا

بالغ و عاقل شخص اگر کسی بند چیز کی چوری کرے، جس کی قیمت ایک چوتھائی مثقال خالص سونے کے مساوی ہو تو عدالت میں پیش ہوگا اور دو مرتبہ اقرار یا بیّنہ کے بعد اس کے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیاں قطع کی جائیں گی اور اگر وہ دوبارہ اس جرم کا مرتکب ہوا تو پھر قدم کے بیچ سے اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ تیسری دفعہ حبس دوام کی سزا دی جائے گی نیز اگر وہ زندان میں بھی سرقہ کرے گا تو پھر قتل کیا جائے گا۔

حد جاری ہونے سے پہلے اگر اس نے کئی بار چوری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اس پر ایک ہی حد جاری ہوگی۔ بچے اور مجنون کے لیے حد نہیں، تعزیر ہے۔ چور کو مطلق طور پر تاوان دینا پڑے گا۔ تاوان کے سلسلے میں ایک مرتبہ کا اقبال اور ایک عادل گواہ کی شہادت قسم کے ساتھ کافی ہے۔

بیٹے کا مال چرانے پر باپ کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے، لیکن برعکس اس کے بیٹے کے ہاتھ قطع کیے جائیں گے۔

Marfat.com

محارب کی سزا

شہر، صحرا یا دریا میں لوگوں کو ڈرانے، دھمکانے، لوٹ مار کے ارادے سے ہتھیار دکھانے والے کو حاکم شرع حسب صوابدید قتل، پھانسی، ہاتھ کاٹنے، پیر قطع کرنے یا شہر بدری کی سزا دے سکتا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ[1]

جو لوگ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جنگ کرتے ہیں اور دنیا میں فساد پھیلانے کی سعی کرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ یا تو انہیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا مخالف سمت سے ہاتھ پیر کاٹے جائیں اور یا پھر شہر بدر کر دیا جائے۔

شہر بدری کی صورت میں مجرم کو جس علاقہ میں پابند کیا جائے وہاں کے باشندوں کو تحریراً مطلع کر دینا چاہیے تا کہ لوگ اس کے ساتھ ترک موالات (سوشل بائیکاٹ) کریں، یہاں تک کہ وہ تائب ہو جائے۔

گھر پر حملہ کرنے والا چور (ڈاکو) بھی محارب ہے۔ یہ اگر قتل ہو جائے تو اس کا خون رائیگاں تصور ہو گا۔

اگر کوئی شخص کسی خاتون کی عزت یا بچے پر حملہ کرے تو انہیں حفاظت خود اختیاری کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اگر حملہ آور مر جائے تو اس کا خون بھی رائیگاں جائے گا۔

ٹھگ، نوسرباز اور جھوٹے گواہ لائق تعزیر ہیں۔ حاکم مناسب سزا تجویز کر سکتا ہے۔

مختلف سزائیں

کسی چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنے والا واجب التعزیر ہے۔ باز نہ آنے کی صورت میں مستوجب قتل ہو گا۔ ایسا چوپایہ جس کا گوشت کھایا جاتا ہو، بدفعلی سے اس کا گوشت حرام ہو جائے گا، بلکہ اس کی نسل کا گوشت بھی ناجائز ہو گا۔ اس کے لیے حکم یہ ہے

---

[1] المائدة: ۳۳

Marfat.com

کہ جانور کو ذبح کر کے جلا دیا جائے اور مالک کو قیمت دلوا دی جائے۔ مشتبہ جانور کو قرعہ اندازی کے ذریعہ نکالنا چاہیے۔ لیکن جن حیوانات کا گوشت ناقابل خوردنی ہو، انہیں دوسرے شہر میں فروخت کر کے ان کی قیمت تصدق کر دینا چاہیے۔ مال اگر مجرم کا نہیں ہے تو جس کا نقصان ہوا، اس کے نقصان کی تلافی ضروری ہے۔ دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار کرنے سے جرم ثابت ہو جائے گا۔

میت کے ساتھ جنسی بے راہروی اختیار کرنے والے کے لیے وہی حکم ہے جو زندہ کے لیے ہے، بلکہ یہاں عقوبت زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ بیوی اور مملوکہ کی صورت میں مناسب سزا دی جائے گی۔ اس کے ثبوت کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو زنا اور لواطت کی ہیں۔

استمنا بالید (جلق) کرنے والا بھی لائق تعزیر ہے۔

ہر شخص ممکن طریقہ سے اپنی، اپنے مال، جائیداد اور متعلقین کے لیے مدافعت کر سکتا ہے، لیکن پہلے آسان اور پھر تدریجاً سخت ذرائع اختیار کرے۔

کسی کے گھر میں جھانکنے والے کو اگر گھر والوں نے سنگ وخشت کا نشانہ بنا دیا اور اس ضرب سے اس کا کام تمام ہو گیا تو اس کا خون رائیگاں سمجھا جائے گا۔

قصاص اور دیت

قتل ناحق سب سے بڑا گناہ اور عظیم ترین فساد ہے۔

جان بوجھ کر کسی مومن کو ہلاک کرنے کی سزا جہنم ہے جس سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خٰلِدًا[1]

اگر کوئی شخص کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے۔

جرم خواہ اس حد تک ہو کہ کوئی جان تلف ہو جائے یا اس قدر کہ انسان کے جسم کا کوئی جزو ضائع ہو جائے، بہر حال جرم جرم ہے۔

قتل کی تین صورتیں ہیں:

---

[1] النساء: ۹۳

Marfat.com

۱۔ قتل عمد ۲۔ شبہ عمد ۳۔ خطاء محض

قتل عمد کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ شبہ عمد کا مطلب یہ ہے کہ مجرم نے کوئی اقدام تو کیا ہو مگر قتل کی نیت نہ رکھتا ہو۔ مثلاً کسی کو تادیباً زد و کوب کیا جائے اور وہ اس صدمہ سے مر جائے یا کسی مریض کو کوئی دوا پلا دی جائے اور وہ اس کا کام تمام کر دے۔

خطائے محض کا یہ مفہوم ہے کہ مقتول سے متعلق نہ ارادہ ہو، نہ اقدام اور خون ہو جائے۔ جیسے کوئی شخص کسی پرندہ کو نشانہ بنا رہا ہو مگر غلطی سے انسان ہدف بن جائے یا کوئی آدمی اپنی بندوق اٹھا رہا ہو اور وہ چھوٹ کر کسی کو ہلاک کر دے۔

اس کی زیادہ واضح قسمیں سوئے ہوئے آدمی، بے خیال شخص، پاگل اور ناسمجھ بچے کے افعال ہیں۔

ان تمام انواع میں براہ راست، بالواسطہ اقدام اور انفراد و اشتراک یکساں حکم رکھتے ہیں۔ قصاص کا تعلق صرف قتل عمد سے ہے۔ شبہ عمد اور قتل خطا میں دیت ادا کرنا پڑتی ہے۔ قصاص کے لیے مجرم کا بالغ و عاقل ہونا شرط ہے۔ بچہ اور مجنون قابل قصاص نہیں ہیں۔ مقتول کے لیے بھی عقل و بلوغ ضروری ہے۔ چنانچہ اگر کوئی بالغ کسی نابالغ کا خون کر دے تو اس کے لیے قصاص کی بجائے دیت ہے۔ بعض قصاص کے بھی قائل ہیں۔ یہی کیفیت مجنون کی ہے۔

جزوی نقصان میں اختیار معتبر ہے۔ مگر ہلاکت نفس میں جبر و اکراہ کا کوئی اختیار نہیں۔ کیونکہ خون کے معاملے میں تقیہ ناجائز ہے۔ مقتول کا معصوم النفس ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنی ایسا شخص نہ ہو جسے قتل کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

مجرم رشتہ میں مقتول کا باپ، دادا یا پردادا بھی نہ ہو۔ کیونکہ آبا و اجداد سے بیٹے یا پوتے کے قتل کے سلسلہ میں قصاص نہیں لیا جا سکتا، بلکہ انہیں صرف دیت ادا کرنا پڑے گی۔ مسلمان صرف مسلمان کے خون کی وجہ سے مستوجب قصاص ہو گا۔ اسی طرح آزاد سے صرف آزاد کا قصاص لیا جائے گا۔

آزاد مسلمان کا خون بہا یہ ہے: سو اونٹ یا دو سو گائیں یا ایک ہزار بھیڑیں یا دو سو حلے یا پھر ایک ہزار دینار جو پانچ سو تر کی پاؤنڈ کے مساوی ہوتے ہیں۔

اگر مقتول کے وارث دیت لینے پر راضی ہو جائیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا،

Marfat.com

اور قاتل کو ایک سال کے اندر اندر دیت ادا کرنا پڑے گی۔

شبہ عمد میں خون بہا کی ادائیگی کے لیے دو سال کی مدت رکھی گئی ہے۔

قتل خطا میں تین سال کی مدت ہے اور ہر سال ایک تہائی واجب الادا ہو گی۔

جزوی نقصانات، جیسے ہاتھ پیر کاٹ ڈالنا، یا آنکھ پھوڑ دینا وغیرہ۔ اس میں عمداً اقدام کرنے کا قصاص آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہے:

وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ [1]

آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہیں اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر لیا جائے۔

خطا اور شبہ عمد میں ہر عضو کے بدلے یا پوری دیت ادا کرنا پڑے گی یا نصف یا نصف سے کم۔

اعضائے مفرد (طاق) جیسے ناک وغیرہ کی دیت پوری ہے اور جفت مثلاً آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، ان میں سے ہر ایک نصف اور دونوں کی پوری دیت ادا کی جائے گی۔ شبہ عمد میں دیت کا ذمہ دار خود مجرم ہے اور خطائے محض میں متعلقین کو ادا کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے فقہ کی مبسوط کتب موجود ہیں۔

چونکہ ہم انتہائی اختصار سے کام لے رہے ہیں، اس لیے بہت سے ابواب کا تذکرہ نہیں کر سکے۔ پھر ہمارا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ کچھ جھلکیاں دکھا دی جائیں اور اشاروں میں بات ختم ہو جائے۔

اس کتاب میں جو کچھ بیان ہوا ہے اسے امامیہ عقائد و مسلمات کے صرف عناوین کی حیثیت حاصل ہے۔ شرح و بسط کے لیے ان اوراق میں گنجائش کہاں؟

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

اب فرمائیں علمائے دین اور عامۃ المسلمین کہ ہم نے جو حقائق پیش کیے ہیں،

---

[1] المائدۃ: ۴۵

Marfat.com

ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی تھی جسے اسلام کی بربادی کا سبب کہا جائے؟ یا یہ کہ کوئی بھی ایسا مسئلہ ہے جو یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور زرتشتیت سے ماخوذ ہو؟ یا ان مباحث میں کوئی ایسا پہلو نظر آتا ہے جو دین توحید کے بنیادی نظریات اور کتاب و سنت کے مخالف معلوم ہوتا ہو؟

خدارا انصاف کرو اور بہتان تراشیوں سے باز آ جاؤ۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ برادران اسلام شکوک وشبہات کی دنیا سے نکل کر قرآن کے پرچم کے سایہ میں ایک نظر آئیں اور اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب تک فرقہ وارانہ جھگڑوں کا خاتمہ نہیں ہوگا اس وقت تک عزت کی سحر نمود نہیں کر سکتی۔ اللہ ہمیں باہمی رواداری کی توفیق عطا فرمائے اور محبت کے رشتوں کو استحکام حاصل ہو۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

خاتمہ

مسئلہ بداء

اس مسئلہ کے ضمن میں بھی شیعوں کو بہت مطعون کیا جاتا ہے۔ غلط حاشیہ آرائی کرنے والے نظریہ بداء کو مسخ کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شیعوں کے عقیدے میں خداوند عالم ایسے کام کر بیٹھتا ہے جن کا اسے علم نہیں ہوتا (معاذاللہ)۔ اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہوسکتی ہے؟ یہ تو کفر صریح ہے، کیونکہ اس سے ایک طرف تو ایزد متعال کی صفت علم کا انکار لازم آتا ہے اور دوسری جانب وہ محل حوادث اور آماجگاہ تغیرات قرار پاتا ہے جس سے شان وجوب کی نفی ہوتی ہے۔ امامیہ فرقہ ان واہی تواہی خیالات کی قطعاً نفی کرتا ہے، بلکہ کوئی اسلامی فرقہ بھی اس گمراہ کن فکر کے حق میں نہیں۔ البتہ تجسیم پر ایقان رکھنے والے بعض عناصر کی طرف ان خرافات کو نسبت دی جاتی ہے۔ چنانچہ خدا کے بارے میں یہ ان ہی میں سے کسی کا قول ہے:

اعفونی عن الفرج و اللحیة و اسئلونی عما شئتم

بس واڑھی اور شرم گاہ کے بارے میں مجھے معاف رکھو اور باقی جو چاہو، پوچھ لو۔

صحیح نظریہ بداء جس کے شیعہ قائل ہیں، وہ تو آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسرار و رموز میں شامل ہے۔ چنانچہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں وارد ہے:

انّہ ماعبد اللّٰہ بشئی مثل القول بالبداء و انّہ ماعرف اللّٰہ حق معرفتہ من لم یعرفہ بالبداء۔[1]

---

[1] اصول الکافی ۱:۱۱۳

Marfat.com

اقرار بداء سے جس طرح فرض بندگی ادا ہوتا ہے اس طرح کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ جس نے بداء کو دلیل عرفان نہیں بنایا اسے اللہ کی پوری معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

اس مضمون کی اور بھی روایات ہیں۔ حقیقت یہ کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس سے قدرت نے اپنے ملائکہ و رسل کو مالا مال کیا ہے۔ اس دانش و آگہی کے مطابق یقینی طور پر وہی ہوگا جو انہیں بتایا گیا ہے۔ مگر دوسری قسم وہ ہے جس سے نہ کوئی مقرب بارگاہ فرشتہ واقف ہے اور نہ کوئی برگزیدہ نبی! بس وہی جانتا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق وہ تقدیم و تاخیر اور محو و اثبات جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ علم کی وہ منزل ہے جسے باری تعالیٰ نے ام الکتاب سے تعبیر فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ [1]

اللہ جسے چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

اس سے معبود برحق کی قدرت کاملہ، حکمت بالغہ اور اس کے مختار مطلق اور فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فسخ کو جو حیثیت تشریع میں حاصل ہے، وہی کیفیت تکوین میں بداء کی ہے۔ پس جس طرح تشریعی ضابطوں کی ترمیم، اضافے اور تغیر و تبدل میں اس کی نامعلوم مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں، اسی طرح تکوینی امور میں اخفا و بداء کا تعلق ان اسرار و رموز سے ہے جن کے فہم و ادراک سے ہماری عقلیں قاصر ہیں۔

بداء کا ایک عنوان یہ بھی ہے کہ خاصان خدا کو ایک بات کا علم ہوتا ہے مگر اس کی شرائط و موانع کی اطلاع نہیں ہوتی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ تو معلوم تھا کہ دولہا شب زفاف مر جائے گا، مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے لیے صدقہ نہ دینا شرط ہے۔

چنانچہ اتفاقاً دولہا کی ماں نے خیرات دے دی اور وہ بچ گیا۔ جب یہ حقیقت مسیح علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئی آپؑ نے فرمایا:

---

[1] الرعد: ۳۹

Marfat.com

تم لوگوں نے اس کی طرف سے کچھ تصدق کر دیا ہوگا۔ صدقہ تمام بلاؤں کو رد کرتا ہے۔[1]

اس قسم کے اور نظائر بھی ہیں۔

ان مواقف کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو نفوس انسانی کی آزمائش ہو جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ خوئے تسلیم پروان چڑھتی رہتی ہے۔ ذبح اسمٰعیل علیہ السلام کے سوال پر جناب ابراہیم علیہ السلام کا امتحان اس کی واضح دلیل ہے۔

نیز اگر بداء نہ ہو تو دعا، تصدق، شفاعت و توسل اور انبیاء و اولیاء کی گریہ و زاری نیز کمال اطاعت کے باوجود ان کے خوف و ہراس کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔ ہاں! ان ذوات مقدسہ کے لرزاں و ترساں ہونے کا سبب وہ علم مکنون ومخزون ہے جس سے کوئی آگاہ نہیں اور یہی بداء کا سرچشمہ ہے۔

بداء کی اقسام، قضا و قدر اور لوح محو و اثبات کی تفصیل مقصود ہو تو ہماری کتاب الدین و الاسلام کی پہلی جلد کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس مجموعہ میں ہم نے شرح و بسط کے ساتھ ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

تقیہ

تقیہ کے معاملے میں بھی شیعوں کو خوب خوب بدنام کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ عام اہل اسلام اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اگر نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شیعہ حضرات جس تقیہ کے قائل ہیں وہ صرف ان ہی سے مختص نہیں بلکہ یہ ایک عقلی ضرورت اور فطری تقاضا ہے۔

شریعت اسلامی کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں عقل و دانش کا توافق نہ دکھائی دے۔ ہر مسئلہ میں علم وخرد ساتھ ساتھ نظر آئیں گے۔

انسانی فطرت کا جائزہ لیجیے تو اقرار کرنا پڑے گا کہ ہر انسان اپنی جان کا بچاؤ کرتا ہے۔ جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ البتہ اگر عزت و وقار پر آنچ آنے لگے یا حفاظت حق کا معاملہ درپیش ہو تو پھر حد درجہ عزیز ہونے کے باوجود ہستی کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، لیکن

---

[1] امالی شیخ صدوق: ۲۰۴۔۱۳

Marfat.com

اگر یہ امور نہ ہوں تو پھر کون ہوشمند ہو گا جو جان جوکھوں میں ڈال کر جگ ہنسائی کروانے کے لیے تیار ہو؟ اس کے علاوہ بے ضرورت تہلکہ میں پڑنا عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔

اس لیے شارع مقدس نے اجازت دی ہے کہ وہ مسلمان جو خطروں میں گھرا ہوا ہو اور اس کی جان یا ناموس کو گزند پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہو وہ باطناً عمل کرتے ہوئے ظاہر بظاہر اخفائے حق سے کام لے سکتا ہے۔

کلام الٰہی میں:

اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً [1]

مگر (اس قسم کی تدبیروں سے) کسی طرح ان (کے شر) سے بچنا چاہو....

اور

اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ [2]

... جو (کلمہ کفر پر) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کی طرف مطمئن ہو....

سے یہی مقصود ہے۔

تاریخ اسلام میں جناب عمار، ان کے والدین نیز بعض دیگر اصحاب کے واقعات موجود ہیں کہ کافروں کے ظلم سے مجبور ہو کر وہ اظہار کفر کر بیٹھے۔[3]

تقیہ پر عمل کرنے کے تین احکام ہیں:

۱۔ بے مقصد جان جا رہی ہو تو واجب ہے۔

۲۔ اگر اظہار حق مفید مقصد ہو تو عمل اور ترک عمل میں اختیار ہے۔

۳۔ لیکن اگر باطل کو قوت پہنچے، امت گمراہ ہونے لگے اور جور و ستم میں شدت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر تقیہ حرام ہے۔

آیئے! اب ہم اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں، تا کہ ہر باضمیر انسان کو یہ

---

[1] آل عمران: ۲۸ [2] نحل: ۱۰۶

[3] التبیان فی تفسیر القرآن للشیخ الطوسی ۶: ۴۲۸۔ مجمع البیان للشیخ طبرسی ۳: ۳۸۷۔ جامع البیان للطبری ۱۴: ۱۲۲۔ تفسیر کبیر للرازی ۱۹: ۱۲۰۔ الکامل التاریخ لابن الاثیر ۲: ۶۰۔

Marfat.com

فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ تقیہ پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں غریب شیعہ قابل ملامت ہیں (بشرطیکہ یہ عمل قابل ملامت ہو) یا وہ عناصر جنہوں نے ان کی آزادیاں چھین کر تقیہ کے لیے مجبور کر دیا۔

معاویہ نے غلبہ حاصل کرتے ہی شریعت کو کھلونا بنا لیا تھا اور ہاتھ دھو کر شیعیان علی علیہ السلام کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ شیعوں کا خون پانی سے زیادہ سستا تھا۔

مروانی حکومت بھی اسی غلط سیاست پر کاربند رہی۔ اس کے بعد عباسیوں کا دور آیا۔ انہوں نے مشق ستم میں اور تیزی پیدا کر دی۔ نتیجتاً محبان اہل بیت علیہم السلام کو مختلف موقف اختیار کرنا پڑے۔ کبھی چھپے، کبھی ضرورتوں نے انہیں مخفی رہنے پر مجبور کیا اور کبھی حمایت حق کے جوش میں سر سے کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے تاکہ ان کے خون کی دھاریں نشان منزل کا کام دیتی رہیں۔

چنانچہ بہت سے شیعہ اعاظم نے تقیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی اور دنیائے ظلم کا مقابلہ کر کے خلعت شہادت زیب تن کی۔

شہدائے مرج عذرا[1] کی داستان خاصی شہرت رکھتی ہے۔ یہ چودہ جاں باز تھے جنہوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مثالی عبادت گزار صحابی حجر بن عدی کندی کی قیادت میں اپنی جانیں جان آفریں کے سپرد کر دیں۔

حجر بن عدی فتح شام کے نامور فوجی رہنما بھی تھے۔ معاویہ کے الفاظ ہیں:

> مرج عذرا میں، میں نے جن لوگوں کو تہ تیغ کیا ہے، ان میں سے ہر ایک کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ میں نے اسے کیوں قتل کیا، مگر حجر کے بارے مین لاجواب ہونا پڑتا ہے کہ آخر میں نے انہیں کس جرم میں شہید کیا؟[2]

ہاں! ہم بتاتے ہیں کہ حجر کا کیا قصور تھا؟ اس شہید نے تقیہ کی ضرورت نہیں سمجھی اور صرف اس لیے کہ آل امیہ کا ستم عالم پر آشکارا ہو جائے اور دنیا کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس گھرانے کا دین سے کتنا تعلق ہے!

نیز صحابی جلیل عمرو بن حمق خزاعی اور عبدالرحمٰن بن حسان عنزی کا واقعہ کسے یاد

---

[1] مرج عذرا شام کے ایک قریہ کا نام ہے۔
[2] تاریخ طبری ۵: ۲۵۳۔ تاریخ کامل لابن اثیر ۳: ۲۷۲۔

Marfat.com

نہیں۔ ابن زیاد نے انہیں زندہ دفن کروا دیا تھا۔[1]

میثم تمار، رشید ہجری اور عبد اللہ بن یقطر کو دار پر کھینچوایا گیا۔ یہ اور ان کی طرح سینکڑوں مجاہدین کی مثالیں ہیں جنہوں نے راہ حق میں باطل کی صفوں سے ٹکرلے کر انہیں پاش پاش کر دیا۔

ان حقیقت پسندوں نے تقیہ پر عمل نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے وقت کا یہی تقاضا تھا۔ ان کے عدم تقیہ نے بقیہ حق کی حفاظت کر لی اور اسلام کو معاویہ، یزید، زیاد اور ابن زیاد کے مذہب و مسلک سے ممتاز کر دیا۔

حسین علیہ السلام اور اصحاب حسین علیہ السلام کے ماجرائے شہادت کو کون بھول سکتا ہے؟ یہ شہیدوں کے قائد اور حریت پسندوں کے سردار تھے۔

ہاں! ان بزرگوں کا جن حالات سے سامنا تھا، ان کے پیش نظر یہ تقیہ کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر کچھ وقت ایسے بھی آئے ہیں جب تقیہ پر عمل واجب اور بعض دفعہ اختیاری فعل تصور کیا گیا۔

خیال پڑتا ہے کہ بعض مرویات میں وارد ہوا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں اپنی نبوت کی تصدیق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تکذیب پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے تو اس کی خواہش مسترد کر دی، نتیجتاً قتل ہو گیا، مگر دوسرے نے اس کی بات پوری کر کے رہائی حاصل کر لی۔

یہ خبر جب سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> پہلے نے جنت کی راہ اختیار کرنے میں جلدی کی اور دوسرے نے مہلت طلب کر لی! دونوں میں سے ہر ایک کو اس کا اجر ملے گا۔[2]

مسلمانو! تقیہ کے بارے میں اپنے بھائیوں کو مطعون نہ کرو۔ خدا ہماری تمہاری عاقبت بخیر کرے اور رشد و ہدایت کے نقطہ پر اتفاق نصیب ہو۔

وَالسَّلاَمُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَكَاتُهُ

☆☆☆☆☆

---

[1] تاریخ طبری ۵: ۲۷۶۔ تاریخ کامل ابن اثیر ۳: ۴۸۶۔
[2] مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۱: ۴۳۰۔ تفسیر الحسن البصری ۲: ۴۲۸۔

Marfat.com

فہرست

آیۃ اللہ کاشف الغطاء ۳
ابتدائیہ ۹
اصل و اصول شیعہ کے بارے میں مغربی علماء اور مستشرقین کی آراء ۱۱
علامہ احمد زکی پاشا کا خط ۱۲
حجۃ الاسلام علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاءؒ کا جواب ۲۰
علامہ الراوی کے اعتراضات اور ان کے جوابات ۲۷
امیر البیان شکیب ارسلان کا خط ۳۱
ہائی کمشنر ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۳۳
دارالتقریب بین المذاھب الاسلامی قاہرہ کے نام
آیت اللہ علامہ کاشف الغطاء کا مکتوب ۳۵
الشیخ محمود شلتوتؒ کا جواب ۳۶
مقدمہ۔ اتحاد امت اصلاح امت کی ناگزیر ضرورت ۳۸
وجہ تالیف ۵۱
شیعیت کی ابتداء اور ارتقاء ۷۴
تاریخ آغاز ۷۴
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ۸۰
نشر و اشاعت ۸۱
سب سے بڑا سبب ۸۵
مزید اسباب ۸۶
فرزندان علی علیہا السلام ۸۷
عہد زریں ۸۸
خلوص کامل ۹۰
چند ضروری باتیں
نظری اور عملی مسائل ۹۲
منصب الٰہی ۹۴
عصمت ۹۵
امامیہ ۹۶

Marfat.com

ائمہ اثنا عشر ۹۷
بنیادی نظریات
توحید ۹۹
نبوت ۱۰۰
امامت ۱۰۱
وجود حجت ۱۰۵
عدل ۱۰۸
معاد ۱۱۰
نظام عمل
ابتدائیہ ۱۱۲
سرچشمہ ۱۱۲
اختلاف ۱۱۳
اجتہاد ۱۱۳
مجتہد ۱۱۴
مقلد ۱۱۴
منصب اجتہاد ۱۱۶
فقہ ۱۱۷
نماز ۱۱۷
۱۔ شرائط نماز ۱۱۹
۲۔ اجزائے وجودی ۱۱۹
۳۔ مبطلات ۱۲۰
روزہ ۱۲۰
زکوٰۃ ۱۲۱
زکوٰۃ فطرہ ۱۲۲
خمس ۱۲۲
حج ۱۲۳
حج کی اقسام ۱۲۴
جہاد ۱۲۶
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۱۲۶
معاملات ۱۲۷
بحث متعہ ۱۲۸

Marfat.com

مسئلہ کا واحد حل ۱۳۶
طلاق ۱۴۴
خلع و مبارات ۱۴۸
ظہار، ایلاء، لعان ۱۴۹
وراثت ۱۴۹
وقف، ہبہ اور صدقات ۱۵۱
مقدمات کے فیصلے ۱۵۳
ذبح و شکار ۱۵۵
خورد و نوش ۱۵۸
حدود اور تعزیرات
حدود ۱۶۰
حد زنا ۱۶۰
لواط اور سحق کی سزائیں ۱۶۱
تہمت کی سزا ۱۶۱
مسکر کی سزا ۱۶۲
چوری کی سزا ۱۶۲
محارب کی سزا ۱۶۳
مختلف سزائیں ۱۶۳
قصاص اور دیت ۱۶۴
خاتمہ
مسئلہ بداء ۱۶۸
تقیہ ۱۷۰

☆☆☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

البلاغ المبین
اسلامی تحقیقاتی واشاعتی ادارہ

AL BALAGH UL MOBEEN
ISLAMIC RESEARCH AND PUBLISHING INSTITUTE
URL: http://www.al-balagh.org
E-mail: info@al-balagh.org
PO Box # 469
Islamabad, Pakistan

Marfat.com